بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

تحریک ادب

شمارہ76،اپریل-2024 جلد نمبر17

Tahreek-e-adab vol-17, issue-76, April 2024

Editor مدیر

Jawed Anwar (Dr.Jawed Ahmad) (ڈاکٹر جاوید احمد) **جاوید انور**

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik Ex.HOD Urdu,Jammu University

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد، ڈاکٹر فروز حیدری،

عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Prof. Arifa Bushra (Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad (Chairman Rosewood Academy,VNS

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,Govt.SPMR College of Commerce,Cluster University of Jammu,Jammu)

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

Vol-17 (جلد نمبر 17) Year of Publication 2024 سال اشاعت:

Issue April 2024، شمارہ 76۔اپریل، شمارہ نمبر

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط:انور جمال

Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین : سرورق

200/-Two Hundred rs. per copy دوسو روپے : فی شمارہ

دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا) : زر سالانہ

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زرِ رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرا اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔خطرات یورپ میں	عارف نقوی	5
2۔اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر:		
ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کی ادبی خدمات	ڈاکٹر محمد مصطفیٰ	8
3۔ابراہیم اشک کی شاعری: ایک عمومی جائزہ	عبدالقہار انجم	12
4۔ناول "ایک چادر میلی سی" کا تجزیاتی مطالعہ	غلام حسن وانی	16
5۔کلام فراقؔ میں صوفیانہ عناصر	سوریہ پرکاش راؤ	23
افسانے: 1۔زاویہ۔ وحشی سعید / اب کیا ہوگا۔ڈاکٹر نذیر مشتاق		28
نظمیں	پروین شیر	41
گوشہءروبینہ میر 1۔روبینہ میر: تلاشِ ذات کی شاعرہ	آغا نیاز مگسی	44
2۔روبینہ میر اور اس کی شاعری	ولی محمد اسیر کشتواڑی	47
3۔روبینہ میر میں ادبی روئیدگی	مسعود حساس	52
4۔روبینہ میر: لمحہءموجود کی شعری نامہ نگار	نعیم جاوید	54
5۔خیابانِ کشمیر کی نوحہ گر: روبینہ میر	ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق	58
6۔روبینہ میر کا شعری "یقین واوہام" کا سفر	ڈاکٹر گلزار احمد وانی	60
7۔روبینہ میر کی شعری کائنات	انجینئر اسلم شہزاد	68
8۔روبینہ میر کی شاعری "تفسیر حیات" کے آئینے میں	ولی محمد اسیر کشتواڑی	72
9۔روبینہ میر: بحیثیتِ شاعرہ	زنفر کھوکھر	77
10۔روبینہ میر "اضطراب" کے آئینے میں	ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی	81
11۔روبینہ میر کی شاعری میں نسائی حسیت	محمد شبیر	87
12۔منتخب نظمیں، منتخب غزلیں	روبینہ میر	95
مضامین: 1۔استاد شہید مطہری کے نقطہءنظر سے اخلاقی فلسفہ	حسنین جسانی	109
2۔اظہار الاسلام: بحیثیت افسانہ نگار	زینت پروین	118
3۔قرۃ العین حیدر کی رپورتاژ نگاری کا مختصر جائزہ	یاسمین کوثر	121
4۔ملا ہادی سبزواری اور ان کی شرح مثنوی رومی	عرفان روپانی	126

Khatraat Europe mein by Arif Naqvi (Berlin, Germany)

عارف نقوی (برلن، جرمنی) cell- 0049-151-706-813-86

خطرات یورپ میں

وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلم ہیں نہ عیسائی ہیں
وہ یہودی بھی نہیں ظلم کے سودائی ہیں

دہشت پسندی کے بارے میں میری نظم جو ۱۹ یا ۲۰ برس قبل شائع ہوئی تھی، اس بات کا ثبوت ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ انسان اشرف المخلوق ہے۔ یہ نظم ہم سے صرف جوش اور جذباتیت کے اظہار کا مطالبہ ہی نہیں کرتی ہے بلکہ عقل وخرد کے استعمال کی توقع بھی کرتی ہے اور چند سوالات کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے جیسے ''کیوں؟ کس لئے؟ کس کے لئے؟''

یہ سوالات جو اس وقت بھی سامنے آئے جب رام چندر جی کو بن باس دیا گیا اور انہیں شاہانہ زندگی کو چھوڑ کر جنگل کے پرندوں اور حیوانوں کے ساتھ رہنا پڑا، جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا، حضرت موسیٰ کو نیل کے پار جانے پر مجبور کیا گیا، حضرت یوسف کو کوئیں میں ڈالا اور غلام کی حیثیت سے بیچا گیا اور حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا گیا جس کی یاد اس ہفتے ساری دنیا میں مقدس جمعہ کے نام سے منائی جائے گی اور پھر ایسٹر کا تیوہار منایا جائے گا۔ اور یہ سوالات اس وقت بھی سامنے آئے تھے جب رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں پر حملے کئے گئے اور ان پر کوڑے پھینکے گئے اور پھر کربلا کی ریت میں آل رسول کو بھوکا پیاسا رکھ کر بربر مظالم ڈھائے گئے اور قتل کئے گئے۔ اور پھر مجھے وہ مناظر یاد آرہے ہیں جو میری اپنی ہی زندگی میں ہندوستان کے مہاتما گاندھی، ایران کے مصدق، کانگو کے لوممبا، چیلی کے الیندے، عراق کے صدام حسین، جرمنی کی کلارا سیٹکن اور دیگر نیک اور سچے قوم پرستوں کے ساتھ اور دوسری جنگ عظیم کے دوران دسیوں لاکھ عورتوں بچوں کے ساتھ پیش آئے تھے۔

ابھی چند روز قبل ماسکو کے ایک ناٹک گھر میں وحشیانہ دہشت پسندی کا بھیانک مظاہرہ کیا گیا ہے، جس میں ڈیڑھ سو بے قصور لوگ، بچے بوڑھے، مرد عورتیں، جو خوشی کے نغمے سننے آئے تھے

گولیوں سے بھون دئے گئے ہیں اور ہر طرف سوگ منایا جارہا ہے۔ یہ حرکت بھی ایک اسلامی دہشت پسند گروپ کے نام سے کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ جب ایسی حرکتوں سے ہر شخص ایسے مجرمانہ گروپ سے نفرت کرے گا تو وہ خود کیوں دعویٰ کررہا ہے کہ یہ جرم اسی نے کیا ہے؟ آ بیل مجھے مار۔

اب جرمنی اور یورپ کے بعض حصوں میں خطرات کا بگل بج رہا ہے۔خصوصاً اس سال فٹبال کے عالمی مقابلوں کے دوران ہر طرف دہشت پسند کاروائیوں کے امکانات پر غور کیا جارہا ہے۔ہمیں امید ہے کہ یورپ کے سبھی ممالک میں، خاص طور سے جہاں میچ ہونے والے ہیں حفاظتی انتظامات بڑھادئے جائیں گے اور دہشت پسند وحشیوں کو کوئی موقع نہیں دیا جائے گا۔لیکن عام انسانوں کو بھی نہایت ہی ہوش مندی اور چوکسی سے کام لینے کی ضرورت ہوگی۔انہیں اس بات کا کوئی موقع نہیں دینا چاہئے کہ ان کے نام سے کوئی وحشیانہ کاروائی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایسی کاروائیوں کی کوششیں ہوں، جن سے بعض لوگوں کے جذبات بھڑکیں اور جنون سوار ہو۔ یا انہیں لالچیں دے کر اور بلیک میل کر کے ایسی حرکات پر مجبور کیا جائے۔لیکن انہیں سوچنا ہوگا کہ انسانیت کا مفاد اور عاقبت ان کے جھوٹے دنیاوی مفاد سے زیادہ اہم ہے۔یہیں پر یہ ثابت ہوگا کہ وہ اشرف المخلوق ہیں یا احمق درندے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر شخص یہی چاہے گا کہ اللہ ہمیں ایسے عذابوں سے محفوظ رکھے۔

میں کوئی جیوتشی نہیں ہوں کہ مستقبل کی پیشین گوئیاں کروں۔ نا ہی کوئی سرجن ہوں کہ پھوڑے کو آپریشن کر کے نکال دوں۔البتہ سوالات کا ایک انبار ہے، جن کے جواب ڈھونڈھتا ہوں۔ لیکن اتنا تو سوچنا ہی پڑتا ہے کہ ایسی خطرناک حرکتوں سے کس کا فائدہ ہوگا۔

کیا ایک چور اور ڈاکو بھی یہ نہیں سوچتا کہ اس کے جرم سے کس کو فائدہ ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ اگر اس کے چہرے پر سے نقاب ہٹادی گئی تو اس کے خدوخال عیاں ہوجائیں گے۔تو اگر مجرم خود کو ملزم کہتا ہے تو کیوں؟ پھر اگر اس کے منصوبوں کا پورا علم کسی دوسرے کو ہوتا ہے، تو چاہے وہ اس کا اپنا سگا بھائی یا بیٹا ہو اس کا کیا فرض ہے؟ کیا وہ اس کی تفصیل کو چھپا کر خود بھی مجرم نہیں ہوجاتا؟ کیا ایسی پردہ پوشی بھی جرم کے مرادف نہیں ہوتی؟ کیا اس کا فرض نہیں ہوتا کہ سارا کچا چٹھا منظر عام پر، خصوصاً حفاظتی حکام کے سامنے پیش کرے؟

ذرا تاریخ پر نظر ڈالئے۔ یورپ میں ایک ہی عیسائی مذہب کے دو فرقوں میں تیس برس

جنگ ہوئی اور لاکھوں انسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔عراق میں کربلا کا ہولناک واقعہ جس کی آج سارا عالم مذمت کرتا ہے، افریقہ سے لاکھوں غلاموں کو زبردستی پکڑ کر ہزاروں کلومیٹر دور دوسرے برصغیر میں لے جانا اور وہاں بھیڑ بکریوں کی طرح ان سے مشقت کروانا، پہلی جنگ عظیم میں لاکھوں انسانوں کا قتل اور بغداد ریل کے خلاف عرب بدوؤں سے دہشت پسندی کروانا اور ریل کی پٹریاں اڑانا، نازی کنسنٹریشن کیمپوں میں دسیوں لاکھ لوگوں پر وحشیانہ مظالم، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، لیبیا، عراق، کے خلاف سازشیں اور ساری دنیا میں جمہوریت اور قوم پرستی کو کچلنے کے لئے فسطائیت کا فروغ۔

ایسا لگتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے آزادی، خودمختاری اور جمہوریت کی جو ہوا دنیا میں چلی تھی اس کا رخ بدلنے کے لئے فسطائیت اور دہشت پسندی ساری دنیا میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔جس کے لئے نارتھ آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ جھگڑا شروع کیا گیا جس کا روپ ہولناک دہشت پسندی تھا۔مسلمانوں میں شیعہ سنّی تفرقہ پیدا کیا گیا اور پھر فلسطین کا مسئلہ کھڑا کیا گیا۔

ذرا غور کیجئے اور حالیہ ماضی کو یاد کیجئے۔ابھی کل تک اسرائیل کے لاکھوں لوگ وزیر اعظم نتین یاہو کے خلاف زبردست مظاہرے کر رہے تھے، اس پر بدچلنی کے الزام لگائے جا رہے تھے۔ تیل افیف کی فضائیں اس کے خلاف نعروں سے گونج رہی تھیں اور اس کی ناؤ ڈگمگا رہی تھی۔

ان حالات میں اس کو خود اس بات کی ضرورت تھی کہ اس کے خلاف کوئی احمقانہ اشتعال انگیز حرکت کر دے، چاہے وہ خود کروائے یا کوئی اپنی حماقت کا ثبوت دے۔جس کا بہانہ لے کر وہ تباہی کی آگ بھڑکا سکے۔جس کا انجام آج ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔اب یورپ میں خطروں کی باتیں کی جا رہی ہیں، خاص طور سے فٹبال کے عالمی میچوں کے وقت۔ایسی منصوبہ بند حرکتیں جن کا مقصد آزادی، جمہوریت، خودمختاری اور امن وامان کے ماحول کو واپس لوٹا کر تاناشاہی کے لئے ماحول تیار کرنا ہے۔ان حالات میں ایسی حرکتیں بھی کی جا سکتی ہیں جن سے کسی ایک مذہب یا فرقے کے لوگوں میں اشتعال پیدا ہو۔

اب دیکھنا ہے کہ ان حالات میں ہم کہاں تک فہم و ادراک، صبر و تدبر، تحمل، عقل و خرد کا ثبوت دیتے ہیں اور ہمیں کہاں تک اصلی معنوں میں اشرف المخلوق کہلانے کا کہاں تک حق ہے؟

☆☆☆

Urdu ke pahle sahib-e-diwaan Arab shair Dr. Zubair Farooq Al- Arshi ki adbi khidmaat by Mustafa (Katihar) cell-9508438198, 9472924715

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ (کٹیہار)

اردو کے پہلے صاحب دیوان عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کی ادبی خدمات

ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی پوری عرب دنیا کے واحد اردو شاعر ہیں جو جنون کی حد تک اردو شعر و ادب کی خدمات میں لگے رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے ۶۷ شعری مجموعے ہیں۔ یوں تو عرب دنیا میں کئی عرب نژاد شاعر ہیں جو اردو زبان سے متاثر ہو کر وقتاً فوقتاً شاعری کرتے ہیں جن میں الادروس کا نام قابل ذکر ہے جو ہندوستان کے مشاعروں میں بھی شرکت کر چکے ہیں، لیکن ان تمام کی ادبی کاوشیں ڈاکٹر زبیر فاروق سے بہت کم ہیں۔ عرب نژاد ڈاکٹر موصوف ۱۹، اگست ۱۹۵۲ء میں متحدہ عرب امارات کے پوری دنیا میں مشہور شہر دبئی میں پیدا ہوئے۔ ۱۱، سال کی عمر سے ہی عربی میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً شاعر ہیں۔ میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کراچی (پاکستان) میں قیام کرنے کے دوران اردو ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی جو جلد ہی ادبی جنون میں بدل گئی۔ شعر کی باریکیاں سیکھنے کے لئے پاکستان کے معتبر شاعر شفیق سلیمی صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پس کہسار'' ۱۹۸۵ء میں لاہور سے شایع ہوا۔ ہندوستان میں ان کے مجموعات کی اشاعت کی ابتدا ان کے تیسرے مجموعہ کلام ''سر کہسار'' سے ہوئی جو ۱۹۸۹ء میں لکھنؤ سے شایع ہوا۔ ۴۵ برس کی اردو خدمات میں ان کے ۶۷ مجموعۂ غزلیات اب تک شایع ہو چکے ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ پس کہسار ۲۔ سر کہسار ۳۔ آیات کرب ۴۔ سرد موسم کی دھوپ۔ ۵۔ لمبی راتیں اور رتجگے ۶۔ تند ہوا کے جھونکے ۷۔ سرد موسم میں خود کلامی ۸۔ سراب سپنے ۹۔ دھند دھواں راستے ۱۰۔ دل شکستہ ۱۱۔ آوارہ خواب ۱۲۔ برف جذبے ۱۳۔ بے دعا شب ۱۴۔ میں اور سرد ہوا ۱۵۔ خزاں سماں ہے بہار موسم ۱۶۔ قصہ ختم ہوا ۱۷۔ بھٹکا ہوا پل ۱۸۔ رقص کناں سایہ ۱۹۔ سورج کی آخری کرن ۲۰۔ حسن تمنا ۲۱۔ برق تپاں ۲۲۔ شہر تنہائی ۲۳۔ آئینے میں بکھرے عکس ۲۴۔ مہر سکوت ۲۵۔ شہر غزل ۲۶۔ وقت

جو ٹھہر جائے ۲۷۔وقت جو گزر جائے ۲۸۔دسکتیں دردل پر ۲۹۔غم کے خدو خال ۳۰۔گرفتارانا ۳۱۔شہر گماں ۳۲۔اشک رواں ۳۳۔عکس جمال یار ۳۴۔ڈوبتے لمحے ۳۵۔خواب ریزہ ریزہ ۳۶۔تن گداز ۳۷۔ایکتا کا چراغ ۳۸۔دل مضطر ۳۹۔سوچ سفر (تین زبان اردو ہندی انگریزی میں کافی ٹیبل بک) ۴۰۔ضبط کے آنسو ۴۱۔دل کی صدا (تین زبان اردو ہندی انگریزی میں کافی ٹیبل بک) ۴۲۔قصہ ستم ۴۳۔خموشی بنی زباں ۴۴۔یاد اور دریچے ۴۵۔لب گویا ۴۶۔کرچیاں ۴۷۔پت جھڑ کی شام ۴۸۔لوح دل ۴۹۔دائروں کے درمیاں ۵۰۔خواب سراب ۵۱۔شہر دل ۵۲۔دھندلکوں کے درمیاں ۵۳۔اتھلے پانی میں ۵۴۔سحر خواب ۵۵۔آزار شناسائی ۵۶۔سخن تراش ۵۷۔جاگے ہوئے لمحے ۵۸۔تیرا رخ زیبا ۵۹۔لفظوں کی سرگوشیاں ۶۰۔صدائے شب ۶۱۔بساط ۶۲۔الفاظ زندہ ہیں ۶۳۔خاک ادب ۶۴۔تبسم زیر لب (مزاحیہ شاعری) ۶۵۔صدائے غزل ۶۶۔بنجر سیپیاں ۶۷۔لباس غم ۶۸۔نظر ستم ۶۹۔پیار کی بولی ۷۰۔حسن تبسم ۷۱۔محبت مر نہیں سکتی ۷۲۔محبت مار دیتی ہے ۷۳۔محبت چھپ نہیں سکتی ۷۴۔حرف شناس ۷۵۔آموختہ ۷۶۔سخن شناس۔ان کے علاوہ بھی ان کے کئی شعری مجموعے ہیں جو کل ملا کر 100 سے زاید ہو جاتے ہیں۔

عربی میں ایک مجموعہ ''الدموع السان القلب (آنسو بہ زبان دل) شایع ہو چکا ہے۔

پاکستان میں میڈیکل تعلیم کے دوران ڈولائٹ (انگریزی) کے ساتھ ہی نمود سحر (اردو) کے بھی مدیر اور رسالے کے سکریٹری رہے۔ٹین ایجر کے نائب مدیر رہے۔ان کی غزلوں کو ہندو پاک کے مشہور گلوکاروں نے آواز دی ہے۔غزلوں کے کئی البم بھی آچکے ہیں۔

کچھ ریکارڈ: ۱۰۰۱ غزلوں پر مشتمل کلیات پہلی مرتبہ ۲۰۰۵ء، دوسری اور تیسری مرتبہ ۲۰۱۰ء میں چوتھی بار ۲۰۱۲ء میں شایع ہوا۔سال ۲۰۱۰ء میں ۳۱ کتابیں (۱۸ اردو اور ۱۳ ہندی) شایع ہوئیں۔دنیا کے مختلف ممالک میں متعدد بار مشاعروں میں شرکت کی ہے۔چند یادگار مشاعرے یہ ہیں۔

۱۹۸۵ء الحمرا (لاہور اور ہالی ڈے ان) اسلام آباد، پاکستان

۱۹۸۸ء بیاد فیض، دبئی

۱۹۸۹ء دہلی میں پہلی اردو عالمی کانفرنس اور مشاعرہ (حفیظ جالندھری ایوارڈ دیا گیا)

۱۹۹۰ء مشاعرہ شہر قائد، کراچی پاکستان

۱۹۹۱ء جشن فیض لکھنو

۱۹۹۲ء جشن فراق میں شرکت کی

۱۹۹۴ء عالمی مشاعرہ حیدرآباد

ان کے علاوہ بینیا باغ، وارانسی کے عالمی شہرت یافتہ مشاعرے اور ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں ہونے والے مشاعرے میں شرکت کی۔

دیگر عالمی مشاعرے:

۱۹۸۹ء جدہ، سعودی عرب

۱۹۹۰ء بحرین

۱۹۹۱ء دوحہ، قطر میں شام زبیر فاروق منائی گئی

۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۳ء عمان کے مشاعرے میں تین مرتبہ شرکت کی

۲۰۰۹ء احمد آباد

۲۰۱۰ء اندور اور بھوپال

۲۰۰۵ء اور ۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۱ء دبئی میں سید صلاح الدین اور پرنس اقبال کے مشاعروں میں شرکت

دبئی میں سلیم جعفری مرحوم کے منعقدہ جشن اور مشاعرے:

جشن خمار بارہ بنکوی، احمد فراز، جون ایلیا، مجروح سلطان پوری، پیر زادہ قاسم، قتیل شفائی، محشر بدایونی، بشیر بدر، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد، رئیس امروہوی وغیرہ۔

ڈاکٹر اظہر زیدی کے مزاحیہ مشاعرے اور جشن دبئی:

جشن دلاور فگار، انور مسعود، ساغر نظامی، مشتاق یوسفی، ضمیر جعفری وغیرہ

ابوظبی میں منعقدہ عالمی مشاعرے:

۱۹۸۹ء جشن احمد ندیم قاسمی (احمد ندیم قاسمی ایوارڈ دیا گیا)

۲۰۰۴ء اور ۲۰۱۱ء میں ظہورالاسلام جاوید کے منعقدہ مشاعرے

جشن ڈاکٹر زبیر فاروق:

۲۰۰۹ء جبل پور، احمد آباد، حیدرآباد اور وارانسی

۲۰۱۰ء جموں وکشمیر میں ڈاکٹر زبیر فاروق اردو ہفتہ منایا گیا

۲۰۱۱ء علی گڑھ

اخبارات کے چندہ انٹرویو:

(متحدہ عرب امارات) انگریزی اخبارات خلیج ٹائمز اور گلف نیوز
عربی اخبارات الخلیج اور البیان
بھارت، پاکستان اور دوسرے ممالک کے اخبارات میں متعدد انٹرویوز جیسے ٹائمس آف انڈیا، وغیرہ
ٹیلی وژن انٹرویوز:
حیدرآباد، بھوپال، لکھنو، جموں، سرینگر (بھارت)
پی ٹی آئی، لاہور، کراچی
ہماری ایسوسی ایشن (دبئی)، بزم سخن (دبئی)
ظہورالاسلام (ابوظبی)
اپنا چینل۔ سٹی ۴۲ اور سٹی ۹۲ کے ٹیلی وژن پر انٹرویو۔ ریڈیو ایف ایم پر انٹرویو نشر کیا گیا
رسائل میں گوشے اور نمبر:
فنون، تخلیق اور بیاض (پاکستان)
بیسویں صدی، شمع اور تحریک ادب
ایوارڈ:
حکومت پاکستان کا تمغۂ امتیاز اور دوسرے پاکستانی ایوارڈز
بھارت میں: غالب ایوارڈ (دہلی) امتیاز اردو (چنئی)، محسن اردو (وارانسی) خادم اردو (وارانسی) سفیر اردو (علی گڑھ) رابندر ناتھ ٹیگور (کلکتہ) لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (حیدرآباد) اردو رتن ایوارڈ (بنگلور) کرناٹک اردو اکیڈمی ایوارڈ (بنگلور) عادل منصوری ایوارڈ (احمدآباد) انٹرنیشنل پیس ایوارڈ (بریلی) بشیر بٹ ایوارڈ (پونچھ) شہزادۂ ادب ایوارڈ (جبل پور) مہراجہ پرتاپ سنگھ ایوارڈ (جموں) سید حبیب اللہ ایوارڈ (سورنکوٹ) ماسٹر عبدالعزیز وانی محسن ایوارڈ (راجوری) آئینۂ اردو ایوارڈ (بنارس)۔

دیگر ممالک میں بھی ایوارڈز سے نوازے گئے۔ اردو خدمات اب بھی جاری ہیں۔

تقریباً تیس برسوں تک ہر ہفتہ ڈاکٹر زبیر فاروق العرشی کے دولت کدے (دبئی اور شارجہ) پر ادبی نشست کا اہتمام ہوتا رہا۔ اس میں جتنے افراد بھی شرکت کرتے، ان کا ڈنر ریستوران سے آتا چاہے شرکاً کی تعداد ۲۰ ہو یا ۵۰ یا اس سے بھی زیادہ۔ اردو ادب کی خدمات کے سلسلے میں یہ ایک ایسا عالمی ریکارڈ ہے جہاں تک شاید ہی کوئی پہنچ سکے۔ ☆☆☆

Ibrahim Ashq ki shairi: Ek Umoomi by Jaeza Abdul Qahhar Anjum
(Research scholar ,Dept. of Urdu, Purniya University, Purniya)

ابراہیم اشک کی شاعری: ایک عمومی جائزہ

عبدالقہارانجم (ریسرچ اسکالر، پورنیہ یونیورسٹی، پورنیہ)

یوں تو ابراہیم اشک نے تمام اصناف شعر پہ طبع آزمائی کی ہے۔غزل، نظم، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، حمد، نعت، منقبت، دوہا اور سلام وغیرہ۔ اصناف شعر میں انہوں نے کئی تجربے بھی کئے۔ خصوصاً رباعی کی بحروں میں ان کے کئی تجربے سامنے آئے۔ انہوں نے کئی نئی بحریں ایجاد بھی کیں۔ مثلاً لعلن، چہارن، بحر آئینہ، بحر بیکراں اور بحر ہند وغیرہ۔ ان کا اختراعی اور اجتہادی ذہن دیکھنا ہو تو ان کی رباعیات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ رباعی کے حوالے سے انہوں نے کئی نئے تجربے کیے اس سے قبل اردو شاعری میں کبھی ایسے تجربے نہیں کئے گئے۔

اشک کے کئی شعری مجموعے اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوئے، ان کا پہلا شعری مجموعہ 'الہام' 1991ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی مجموعے آگہی، کربلا، الاو، اللہ ہی اللہ، سرمایا، الماس، آسمان غزل اور محفوظ مجھے کر لو وغیرہ منظر عام پر آئے جن کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی اور داد و تحسین سے نوازے بھی گئے۔ نثری ادب کی بات کریں تو فکشن اور تحقیق و تنقید کی بھی کئی کتابیں سامنے آئیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اشک کی پوری زندگی ادب کی خدمت میں گزری وہ نہایت سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ ادبی کارنامے انجام دیتے رہے، جبکہ وہ فلمی دنیا جڑے رہے ایک گلیمرز دنیا میں رہ کر بھی وہ شعر و ادب کے تئیں اتنے سنجیدہ رہے یہ حیرت کی بات ہے عموماً فلموں سے جڑ جانے کے بعد شعر و ادب کی دنیا سے لوگ کنارہ کش ہو جاتے ہیں یا پھر اتنے فعال نہیں رہ پاتے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کریں تو فیصلہ کر پانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ نقاد بڑا ہے یا شاعر، بہر حال میں اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے ان کی شاعری کے حوالے سے ایک عمومی جائزہ پیش کرنے کی سعی کروں گا۔

غزل شروع سے تجربات و مشاہدات کی شاہراہوں سے گزرتی ہوئی نت نئے موضوعات کو دامن میں

سمیٹے ہوئے وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔شاید ہی ایسا کوئی شاعر ہو جو شاعری کرتا ہو اور غزل نہ کہتا ہو، غزل تو سب کی ہوئی لیکن غزل کا کون ہوا؟ یا غزل کس کی ہوئی؟ غزل نے کس شاعر کو اور کتنے شاعر کو سرخروئی عطا کی؟ غزل کے حوالے اپنی ایک منفرد پہچان اور اسلوب کے ساتھ کتنے شاعر سامنے آئے؟ اسے ایک مفروضہ مان کر جب ابراہیم اشک کی شاعری کا جائزہ لیتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ابراہیم اشک نہ صرف غزل کے ہوئے اور غزل اس کی ہوئی، بلکہ جس صنف پر طبع آزمائی کی وہ اس صنف کے ہو کر رہ گئے اور ہر صنف میں اپنی ایک الگ شناخت اور انفرادیت قائم رکھنے کی سعی کی۔

ابراہیم اشک کی شاعری کا جب مطالعہ کرتا ہوں تو ان کا یہ اختصاصی پہلو ہر جگہ نظر آتا ہے کہ وہ کچھ نیا اور عام ڈگر سے ہٹ کر (خواہ فکری اعتبار سے ہو یا فنی اعتبار سے) کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی نئے تجربے سامنے آئے۔ نیا تجربہ وہی آدمی کر سکتا ہے جس کی فن پر گرفت مضبوط ہو، اظہار و بیان پر قدرت رکھتا ہو۔عروض اور بلاغت کی باریک بینیوں کو سمجھتا ہو اور یہ سب کچھ دو چار دن کے مشق سخن سے ممکن نہیں بلکہ برسوں کی فنی و فکری ریاضت کے بعد ہی یہ استعداد پیدا ہوتی ہے یا پھر ہو سکتی ہے۔

اشک کی ایک بڑی خوبی اور نظر آتی ہے کہ وہ جس صنف کو ہاتھ لگاتے ہیں اس صنف میں وہ ڈوب جاتے ہیں، رم جاتے ہیں، نہایت گہرائی و گیرائی کے ساتھ اس صنف کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ایک عبادت گزار کی طرح وہ شعر و ادب کی عبادت کرتے ہیں، وہ اپنی عبادت میں سچے پکے ہیں اس لئے ان کے اندر ایک قسم کی خوداعتمادی پیدا ہوگئی ہے اور یہ خوداعتمادی کھوکھلی نہیں ہے۔آیئے چند اشعار کی روشنی میں ان کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

مت چھیڑ مجھے کہ عبادت گزار ہوں میں ۔۔۔ سجدہ ہے میرا شعر غزل ہے مری نماز
نماز شعر و سخن ہی میں گم رہے ہر دم ۔۔۔ تمام عمر اسی طور سے عبادت کی
لمحہ لمحہ ہے مجھے فکر غزل ۔۔۔ اس صدی کا اک سخنور مجھ میں ہے
سوچوں اگر تو فکر دو عالم بھی کم مجھے ۔۔۔ لکھوں تو حرف حرف مرا کائنات ہے

محولہ بالا اشعار پر غور کریں تو اشک سے غزل کا رشتہ کتنا مضبوط اور مربوط نظر آتا ہے جو شاعر شعر کو سجدہ کی طرح اور غزل کو نماز کی طرح برتے، اس کے اخلاص و شعور اور ادراک کی پاکیزگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بلاشبہ اشک کا لمحہ لمحہ فکرِ غزل میں گزرا اور تمام عمر وہ نمازِ شعر وسخن میں ہی گم رہے۔ اس عبادت اور ریاضت کے بعد ہی رموزِ شعر وسخن کی معرفت حاصل ہوسکتی تھی اور تبھی کوئی ایقان اور عرفان کی منزل سے گزر سکتا تھا۔ بلاشبہ ابراہیم اشک نے حرف حرف میں تصورات اور تخیلات کی ایک دنیا سمونے کی سعی کی ہے، نہایت سیدھے سادے انداز میں اپنی بات عمدگی کے ساتھ قاری تک پہنچانے میں وہ حد درجہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

ان کا مزاج رومان پرور ضرور ہے، مگر روایتی نہیں ہے، روایت سے استفادہ اور انحراف کی دونوں صورتیں سامنے آتی ہیں، نئے تشبیہات وتلازمات کے استعمال سے ان کی ہنرمندی سامنے آتی ہے، ان کی شاعری میں رومان اور عہد حاضر کا حسین سنگم نظر آتا ہے، وہ کبھی کسی رجحان یا ازم سے متاثر نہیں ہوئے اس لئے ان کی شاعری پر کوئی مہر ترقی پسندی کا یا جدیدیت کا نہیں لگایا جاسکتا نہ تو وہ ترقی پسندوں کا شور شرابہ اور خطیبانہ لہجہ قبول کیا اور نہ ہی جدیدیت کے Fashion Tools یعنی ابہام و ایہام، گاڑھی علامات وتشبیہات کو خاطر میں لایا، دونوں کے ردوقبول میں توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنا لہجہ، اپنا اسلوب تراشتے ہوئے آگہی کی منزل سے گزرنے کی سعی کرتے رہے ہیں؟

جہاں ترقی پسند وجدید ٹھہر گئے کہ اشک آگہی اپنی وہاں سے آگے ہے

اشک کی شاعری کے موضوعات بھی وہی ہیں جو ان کے پیشرو یا ہم عصروں کے تھے، وہی زمانے کی ستم ظریفی، سفاکی، بے مروتی، بے چہرگی، مکروفریب اور استحصال کی مختلف صورتیں، مگر اسے برتنے کا انداز مختلف ہے۔ یہی موضوعات ایک نئے تلازمات وتشبیہات کے ساتھ ایک نئے ڈائمینشن میں پیش کرنے کی کوشش ہر جگہ موجود نظر آتی ہے۔ اشک کی شاعری میں ان موضوعات کا ذکر بار بار مل جائے گا۔ اس کی وجہ زندگی کے وہ تلخ تجربات ہیں جسے اشک نے بھوگا ہے۔ ایک آسودہ زندگی کی حصولیابی کے لئے بنجاروں کی طرح کئی شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزار رنگ چہروں کے درمیان رہ کر ان کی بے چہرگی کو قریب سے دیکھا ہے، ان کی سفاکی اور ستم ظریفی سے اپنی روح کو زخمی کیا ہے، لہذا انہیں دوست اور دشمن کی پرکھ بھی خوب تھی، وہ ڈسنے والوں کو بھی دودھ کا پیالہ دے کر اس کی زہرناکی دیکھنا چاہتے تھے:

ڈسنے والے کو دیا دودھ کا پیالہ ہم نے آزمائش کا یہ دستور نکالا ہم نے

دنیا کی بے مروتی اور بے وفائی دیکھیں:

آؤ رسماً ہی سہی کچھ غم کریں مرگئی دنیا چلو ماتم کریں

اک باشعور شخص کے مرنے کا حادثہ　　　اس کھوکھلے سماج کی زندہ مثال تھا

ابراہیم اشک کو جن کڑے کوس سے گزرنا پڑا ہے اور جن تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ انہوں نے زندگی جینے کا ہنر سیکھا ہے انہیں تجربوں اور مشاہدوں کی شاہراہ سے اپنی شاعری کو بھی گزارا ہے۔ ان کی شاعری فکر و احساس کی شاعری ہے، زندگی کے تمام تلخ و شیریں احساسات و تجربات ان کی شاعری کے موضوعات بنے، اس وجہ کر ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہو گیا ہے، ان کی گہری نظر زمانے کے چہرے پر ٹکی رہی اور ان کی انگلیاں زمانے کا نبض ٹٹولتی رہیں، وہ زمانے کی ہر دھڑکن کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس احساس کو شاعری کے حوالے سے دنیا والوں کو لوٹا دیتے ہیں:

طوالت کو راہ نہ دیتے ہوئے ان کے چند منتخب اشعار پیش کرنے پر ہی اکتفا کروں گا تاکہ آپ شاعری کے حوالے سے ان کے مزاج کو بہتر طور پر سمجھ سکیں:

آزمایا ہے ایسے دنیا نے　　　جیسے ہم بھی کوئی پیمبر تھے

ہر اک کے بس میں نہیں زندگی کو جی لینا　　　بڑے بڑوں نے یہاں حوصلہ گنوایا ہے

گھر ہمارا اپنے کاندھوں ہی پہ تھا　　　ہم تھے بنجارے کہاں بس کے رہے

ابراہیم اشک ایک خوددار، انا پرست انسان تھے، ضمیر سے کبھی انہوں نے سمجھوتہ نہیں کیا اپنے اسلوب اور پُر اعتماد لہجے پر انہیں بھروسہ تھا نیز فکر و فن کی جو دولت انہیں نصیب ہوئی تھی اس وجہ کر کئی اشعار ان کے یہاں ایسے ضرور مل جائیں گے جسے آپ تعلّی سے تعبیر کریں گے مگر یہ تعلّی کھوکھلی نہیں ہے اس حوالے سے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمالیں:

اپنی ہستی کا نہ عرفان ہوا ہو جس کو　　　وہ مری ذات کی عظمت کو بھلا کیا سمجھے

تری زمیں سے اٹھیں گے تو آسمان ہوں گے　　　ہم ایسے لوگ زمانے میں پھر کہاں ہوں گے

چلے گئے تو پکارے گی ہر صدا ہم کو　　　نہ جانے کتنی زبانوں سے ہم بیاں ہوں گے

☆☆☆

Novel "Ek Chadar Maili si " ka Tajziyati Mutalea by Ghulam Hasan Wani

(Research Scholar, dept. of Urdu University of Delhi, Delhi)

غلام حسن وانی (ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف دہلی، دہلی)

ناول ''ایک چادر میلی سی'' کا تجزیاتی مطالعہ

راجندر سنگھ بیدی بلا شبہ اردو زبان کے ایک معروف فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں ۔بیسوی صدی کے سرکردہ اردو فکشن نگاروں کی مختصر سی فہرست میں ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتی ہے۔اپنے عہد کی زندگی بالخصوص خواتین، بچوں بوڑھوں کے معاملات ومسائل اور اپنے سماجی حقائق کے بے باکانہ اور فنکارانہ اظہار کے ضمن میں ان کی تخلیقات اپنی اہمیت رکھتی ہیں۔ان ہی تخلیقات میں سے راجندر سنگھ بیدی کا ایک شاہکار ناول بھی موجود ہے ۔راجندر سنگھ بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' گیارہ مختصر ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ ناول سب سے پہلے رسالہ ''نقوش'' لاہور میں 1960ء میں شائع ہوا اور جلد ہی مشہور ہو گیا۔یہی نہیں اس کے بعد اس ناول کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے اور اس کہانی پر فلم بھی بنائی گئی۔راجندر سنگھ بیدی کو اسی ناول پر ساہتیہ اکادمی انعام سے بھی نوازا گیا۔بیدی افسانہ نگاروں کی فہرست میں تو پیش پیش نظر آتے ہیں۔لیکن ناول نگار کی حیثیت سے دیکھا جائے، تو بیدی کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو پائی، جو افسانہ نگاری کے میدان میں حاصل ہوتی ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بیدی کے اس ناول یعنی ''ایک چادر میلی سی'' کے بارے میں اردو ادب کے ناقدین کی مختلف رائے تھی۔کسی نے اسے ناول کا درجہ دیا تو کسی نے اس کو ناولٹ کے نام سے پکارا اور کسی نے اسے طویل افسانے میں شمار کیا۔ایک اور خاص وجہ ناول کے اصول و تراکیب بھی تھے۔لہٰذا ''ایک چادر میلی سی'' کو الگ الگ ناموں سے پہچانا جانے لگا۔

بیدی نے ''ایک چادر میلی سی'' میں ہندوستان کے مخصوص خطے پنجاب کے چھوٹے سے گاؤں کوٹلہ کو ناول کی کہانی کا محور بتایا، پورے قصے کا کینوس اسی گاؤں پر منحصر ہے۔ بیدیؔ نے وہاں کی روزمرہ زندگی، رہن، سہن رسم و رواج بیان کرنے کے ساتھ کچھ اہم معاشی مسائل پر بھی اپنے قلم کی جولانی دکھائی ہے۔مثلاً، معاشی بدحالی، شراب نوشی، عورت کی مظلومیت، غربت، جہالت، مذہب کے نام پر

ڈھونگ اور افلاس جیسے مسائل کو نہایت ہی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ کینوس پر چند کرداروں کی مدد سے نمایاں کیا ہے۔ مسئلہ کی پیشکش کی نشوونما کردار، مکالمہ اساطیر اور استعاراتی انداز بیان کی بنیاد پر ایک شہکار تخلیق ہے۔ وارث علوی ناول کے اسالیب کے سلسلے میں یوں فرماتے ہیں:

''ناول کی پوری ڈیزائن میں اسالیب کے تینوں رنگ بکھرے پڑے ہیں۔ ناول میں اسالیب بھی فطرت اور انسانی فطرت کی عنصر طاقتوں کی مانند مواد کی وادیوں، پہاڑوں اور جنگلوں پر اپنی برہنہ جنگ کھیلتے ہیں۔ بیک وقت حقیقت نگاری کا سورج تمتماتا ہے۔ اساطیر کی دھند پھیلتی ہے اور استعارات کی دھنک کھلتی ہے۔''۱

راجندر سنگھ بیدی نے اس ناول کے مرکزی کرداروں کے حوالے سے پورے ناول کا پلاٹ تعمیر کیا ہے۔ واقعات میں تسلسل اور روانی برقرار ہے، کہیں کوئی واقعہ پیوند معلوم نہیں ہوتا، بلکہ ایک واقعہ جہاں ختم ہوتا ہے وہیں، دوسرا واقعہ اس کے نتیجے میں شروع ہوتا ہے۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات میں کہیں جوڑ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ناول کے سبھی واقعات آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ان کے تنوع کے ساتھ ساتھ ایک مستقل کا قصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ پورے پلاٹ میں کہیں واقعات میں بے ترتیبی نظر نہیں آتی۔ بیدیؔ نے ایسے معاشرے کی عکاسی کی ہے، جس کے پلاس نہ پیٹ بھر کر کھانے کے لئے روٹی ہے، تن ڈھکنے کے لئے کپڑا، روزگار کے نام پر یکہ چلانے کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں ہے۔ ناول کا کینوس اس پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے کوٹلہ پر محیط ہے۔ کوٹلہ میں وشنو دیوی کا ایک مندر ہے۔ 'رانو' تلوکا کی بیوی اور تلوکا کو شراب نوشی کی عادت ہے ۔صرف ایک یکہ چلا کر وہ اس شوق کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔ اس لئے تلوکا گاؤں کے چودھری گھنشیام داس اور چودھری مہربان داس کے لئے بھولی بھٹکی جاترانوں کو ان کی دھرم شالہ میں پہنچاتا ہے۔ جو ان کی عیاشیوں کا اڈہ تھا اور وہاں وہ جی بھر کر عیاشی کرتے ہیں اور بدلے میں تلوکا کو ایک مٹھے مالٹے کی بوتل یا چانپ مل جاتی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے، تو رانو شراب کی بوتل اس کے ہاتھ میں دیکھتے ہی آگ بگولہ ہو جاتی ہے اسے منع کرتی ہے۔ مگر تلوکا کہاں ماننے والا تھا نتیجتاً دونوں میں جھگڑا ہوتا ہے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ جس کا خاکہ راجندر سنگھ بیدیؔ نے یوں کھینچا ،اقتباس ملاحظہ ہو:

''آناً فاناً تلوکے کی آنکھ کا پانی مرگیا۔ اس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اس کے اڑتے ہوئے کار کے آنکھ کا پانی مرگیا، اس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اس نے اُڑتے ہوئے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں

اس کا پڑا کر دیا۔۔ بڑی۔۔۔ چلائی باپو بچے اندھیرا ڈھونڈنے اور چھپنے لگے ایک تو قع موقع پا کر گھر سے بھاگ گیا دوسرا کونے میں جا لگا دہشت کیعالم میں کا پنا ہوا وہ ماں کے بجائے آں آں کہہ رہا تھا۔حضور سنگھ چارپائی پر سے لپکا۔''۲ ؎

ایسا خوفناک منظر جو گھریلو ماحول سے گھٹن اور افراتفری پیدا کرتا نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرے کی تصویر ہے۔ جہاں جہالت اور لاعلمی کے سبب کوئی اچھی بات سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔ غربت کی انتہا ہونے کے باوجود شراب نوشی لازم ہے اور اگر کوئی مخالفت کرتا ہو،تو اس کا حشر رانی جیسا ہوتا ہے۔گھر میں تلوکا اور رانو کے علاوہ ان کے چار بچے ماں جنداں اور باپ حضور سنگھ اور ایک چھوٹا بھائی منگل ہے۔حضور سنگھ کی آنکھوں کی بینائی لگ بھگ ختم ہو چکی ہے۔جنداں رواتی ساس کی طرح رانو پر ظلم وستم ڈھاتی رہتی ہے۔تلوکہ جس کمسن جاترن کو چودھری کی دھرم شالہ میں چھوڑ آیا تھا۔وہ ان کے مظالم برداشت نہیں کر پاتی ہے اور دم توڑ دیتی ہے۔جس کے ردعمل تر ان کا بڑا بھائی تلوکا کو قتل کر دیتا ہے۔چوہدری مہربان داس گھنشیام داس اور اس لڑکے کے سات سال کی قید ہو جاتی ہے ۔تلوکہ کی اس ناگہانی موت سے رانوں اور اس کے خاندان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہر وقت گھر سے نکلنے پر آمادہ رہتی ہے، گالیاں بکتی ہے، بُرا بھلا کہتی ہے۔کشمکش اور تزبزب، بھرے حالات میں کہانی اس مقام پر آ پہنچتی ہے۔اسی دوران ایک دن جب رانو گپاس چننے گئی ہوتی تھی اور منگل بھی گھر میں موجود نہ تھا۔ چند لوگ بڑی کو دیکھنے آئے دیکھنے کیا یوں سمجھئے کہ خریدنے آئے تھے۔جس کا ذکر ناول میں راجندر سنگھ بیدی نے یوں کیا اقتباس ملاحظہ ہو:

'' منگل کی غیر حاضری میں کچھ لوگ بڑی کو دیکھنے کو آئے تھے ۔بڑی معصوم کچھ نہ کچھ جانتی تھی۔۔دادی کے اشارے پر وہ بڑی کو اُٹھتے بیٹھتے،اندر آتے باہر جاتے دیکھ رہے تھے۔نگاہوں سے تول رہے تھے۔۔۔اور پھر بولا ٹھیک ہے،سب ٹھیک ہے''۔۔۔ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچ سو پر فیصلہ ہوا۔رانو کا ماتھا ٹھنکا۔تبھی بڑی نے اشارہ کیا۔۔رانو اندر گئی تو بڑی نے ٹھیٹ زبان میں ماں سے سب کہہ دیا۔''۳

مذکورہ اقتباس میں راجندر سنگھ بیدی نے ہمیں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس گھر کی حالت اب اتنی بکھر چکی تھی کہ وہ ایک چھوٹی لڑکی یعنی جس کا نام ''بڑی'' کو بھی پیسے کے عوض میں بیچے جا رہے تھے اور بیچنے والی خود اس کی دادی جنداں ہے۔دراصل انسان کی بھوک اور مفلسی کے وقت وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور کہنے کو مقصد یہ ہے کہ دادی کو کوئی شوق نہیں تھا کہ وہ بڑی کو فروخت

کرے۔لیکن مجبوری اور لالچ انسان کو انسانیت سے بہت دور لے جاتی ہے جس سے ہم عام طور پر شعور سے قبول کرنے میں قاصر رہ جاتے ہیں۔ ہزار روپے سے آتے آتے معاملہ ساڑھے پانچ سو پرٹکا جب رانو گھر لوٹی بڑی نے سارا واقعہ کہہ سنایا یہ سنتے ہی رانوں جنداں پر جھپٹ پڑی کہ اس کی ہمت کیسے ہوئی اس کی بیٹی کا سودا کرنے کی ایک طرف تو اپنی ساس کی جلی کٹی باتوں کو سن کر خود رونا شروع کر دیتی تھی۔ پھر آہ و زاری کرتے ہوئے خود سے کہتی ہے:

''ہائے اب میں بڑی کو بکتی دیکھوں گی میں تو صرف کچھ لے کے نہیں آئی تھی تو یہ دُرشا ہوئی۔۔یہ تو بک جائے گئی۔اور وہ بات بات پر اس کی ہڈیاں توڑ دینگے نوچ نوچ کے کھائیں گے کہیں گے تجھے ایسے ہی تو نہیں خرید کے لائے ہیں دام دیے ہیں۔''[۴]

چوں ناول کا مرکزی کردار رانو ایک ماں ہے جو اپنی بیٹی سے بے حد پیار کرتی ہے کیوں نہ کریں''ماں'' جو ہے۔دراصل بیدی نے معاشرے کی بے راہ روی کا ایسا منظر کھینچا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔کتنی ہی مجبوری کیوں نہ ہو کتنی ہی غربت ہو، تنگ حالات ہو، کوئی اپنی پوتی کا سودا کیسے کر سکتا ہے۔معاشرے کی یہ جارحانہ اور بے رحم تصویر بیدی نے ہمارے سامنے لاکھڑا کیا ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ غربت کے سبب انسان کے کردار میں اتنی کمزوری آسکتی ہے کہ وہ فرائض چھوڑ کر بندشیں توڑ کر اس قدر بیگانہ ہو جائے کہ کچھ بھی کر گزرے۔لیکن اس میں قصور صرف غربت کا نہیں اس ماحول میں پرورش کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔جو ان لوگوں کو اپنے آس پاس کے ماحول سے ملتی ہے۔دراصل یہ ہمارے معاشرے کی ایسی حقیقت ہے کہ بیوہ ہونے کے بعد عورت کس قدر مجبور اور لاچار ہو جاتی ہے کہ اس کے دل میں اپنی عزت گروی رکھنے کی بات بھی آجاتی ہے۔وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار ہوتی ہے۔

''تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جا رہی تھی پھاپھاں بیچ میں میرا مردہ کیوں نکال بیٹھی۔۔شرم ہے تو کچھ کھا مر۔۔گھر میں بیسیوں ہولدلیاں پڑی ہیں وافر۔''''نہیں چنوں نہیں'' بانو پکڑتے ہوئے کہا ''وہ بچہ ہے۔۔میں نے کبھی اس ان نجروں سے نہیں دیکھا'' چنوں بولی دیکھ۔۔تجھے اس دنیا میں رہنا ہے۔''[۵]

منگل کا عشق و معشوق جہلم آرا کی بیٹی سلامتی سے چل رہا تھا۔اکثر دونوں کا ملنا جلنا ہوتا تھا اس دن جب گھر میں جنداں نے منگل سے رانو پر چادر ڈالنے کے متعلق بات کی تھی تو وہ تیار ہو کر سلامتی سے ملنے جا رہا تھا۔بیدیؔ نے اس ناول میں سماجی رسم و رواج کی عکاسی کرنے کے ساتھ

ساتھ جنسی اور نفسیاتی جزبات کا بھی بے باکانہ اظہار کیا ہے۔لیکن یہ بیان کہیں کہیں اتنا جارہانہ ہوگیا ہے کہ قاری سوچ میں گم ہوجاتا ہے۔ایسا ہی منظر منگل اور سلامتی کی ملاقات کا ہے:

''آہستہ مگر مضبوط آواز میں منگل پکارا۔۔سلامتی!'ہوں۔سلامتی ایک بیٹھی سی آواز میں بولی''ادھر آ'' وہ بولا اور سلامتی جواب دے بغیر منگل کے پاس آ گئی رک گئی۔۔''اتار دے دوپٹہ'' منگل بولا سلامتی نے دوپٹہ الگ پھینک دیا۔'''نکال دے قمیض'' سلامتی نے قمیض اتار دی ایک لڑکی کے لیے سب سے مشکل بات لیکن اس لمحے کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی دائیاں ہاتھ بائیں اور بائیں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے۔''۷

اس اقتباس کو پڑھ کر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عورت اتنی بے حیا اور بے شرم کیسے ہو سکتی ہے۔ایسا کرنے میں طوئف بھی سو مرتبہ سوچے گی۔اس پر یہ کہ منگل اسے نیم برہنہ کر کے بھی چھونے کا روادار نہ ہوا،ایک عورت کے لئے اس سے زیادہ شکست خوردہ بات نہیں ہوسکتی اور سلامتی اس بات کو لے کر منگل سے بدلہ لینے کی ٹھان لیتی ہے۔نفسیاتی طور پر منگل رویہ کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ گھر سے لڑ جھگڑ کر آیا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ رانو کی وجہ سے بے پریشانی میں مبتلا تھا کہ وہ اس کے ساتھ میاں بیوی کا رشتہ کیسے قائم کرسکتا ہے۔انہی سب باتوں کا اثر سلامتی اور اس کی ملاقات پر پڑا تھا۔جس کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔یہ تو بات رانو کی ہوئی،لیکن منگل کی حالات اس سے بھی بدتر ہوئی تھی چوں کہ آخر کار وہ ایک مرد تو ہی ہے۔اور اس طرح سے راجندر سنگھ بیدی نے دولہا''منگل'' کی عکاسی ناول میں یوں کی اقتباس ملاحظہ ہو:

"عجیب سا دولہا تھا۔بال بکھرے ہوئے اور سر پر پگڑی ندارد۔۔ہاتھ میں کندسی کرپان،سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے،کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کیچ کے لودے،آنکھوں میں محبت کے نشے کی بجائے نفرت،ندامت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلا پن مالائیں اور سانپ،منہ میں دھتورہ اور بھانگ،کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ جھالا اور ہاتھوں میں ترشول۔۔براتی بندر اور لنگور،شیر اور چیتے اور ہاتھی۔۔اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش،وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کتا مکھی کی بھنبھناہٹ،جب منگل کو رانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہولہان تھا۔''۸

مذکورہ بالا اقتباس میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دولہا دولہن دونوں ہی شادی سے ناراض تھے مگر ہمارا معاشرہ انسان کی مرضی پسند ناپسند پر نہیں چلتا چادر ڈالنے کی جو رسم ہمیشہ سے پنجاب میں رائج ہے۔اسے نبھایا گیا پھر چاہیے اس رسم کو نبھانے میں بے جوڑ رشتہ کو جوڑا گیا ہو یا ماں بیٹے کی

عظمت کا سوال ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ دیور بھابھی ہیں اور شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے تو دیور سے بھابھی کی شادی ہونی ہی چاہیے وہ لاکھ دہائیاں دے لے جیسا کہ رانو نے کیا تھا۔ بیدی کی کہانیوں میں پلاٹ کتنے ہی قسم کے کیوں نہ ہو مگر ان کے کرداروں میں عورت کا کردار مقرر کر دیا گیا ہے۔ جیسے ایک چادر میلی سی کی رانو لاجونتی کی لاجو اور اپنے دکھ مجھے دے دو کی اندو ایک امر کردار کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد وہ عورت کے کسی بھی پہلو کو اپنی کہانی کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ بیدی نے رانو کے کردار کو اتنا حقیقی بنا کر پیش کیا ہے کہ اگر ہم اس کردار کو ناول ''امراؤ جان'' اور گئو دان'' کی دھنیا سے ملا کر دیکھیں تو بے جانہ ہوگا۔ رانو کا کردار اتنا امر ہو جاتا ہے کہ ایک جگہ شمیم نکہت لکھتی ہیں۔

''رانو اردو ناول کی تاریخ کا مسلسل نہ ختم ہونے والا انگ ہے جو الزامات اور برائیوں اور کا پلندہ اپنے کمزور کاندھوں پر اٹھائے کبھی دھنیا۔۔کبھی سمن ۔۔کبھی چھمی کبھی امراؤ جان اور کبھی رانو کے روپ میں ملتا ہے۔ رانو ہندوستان کے ہر صوبے ہر گاؤں اور ہر شہر میں پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اس کا لباس اس کی زبان چاہیے مختلف ہو، لیکن بر کھارُت کی آسمان پر پھیلی قوس قزح کا انت ہمیشہ جھکاؤ کی طرف ہوتا ہے۔ جس پر پابندیوں، محبتوں، خلوص، ارمان اور زندگی کی چاہت کے رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنے رنگوں کی چمک کے ساتھ ہمیشہ بجھا بجھا دھواں چھوڑ جاتی ہے۔''۹

راجندر سنگھ بیدی اپنی کہانیوں کو پریم چند کی طرح ساہوکاروں کے جبراً استحصال اور مظالم کی حدوں تک محدود نہیں کرتے۔ بلکہ وہ گھر کی اور معاشرے کی دی ہوئی مصیبتوں سے بھی ہمیں واقف کرواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بیدی کے یہاں کہانیوں میں جنس اور حقیقت کے لوازمات بنیادی عنصر تھے۔ بیدی منٹو کی طرح برہنگی اختیار نہیں کرتے بلکہ سماجی ناانصافیوں، محرومیوں اور ظلم و ستم کے پسِ پشت جذبوں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ وہ تمام تر حالات کا تجزیہ بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے بیدی کی فنکارانہ شخصیت عظیم تر ہو جاتی ہے۔۔ بیدی کی کہانیوں میں عوامی ترجمانی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالاں کہ وہ اس بات کا دعوا کبھی نہیں کرتے کہ وہ عوام کا ترجمان ہے جس کا ذکر خود پرفیسر قمر رئیس نے اپنی کتاب ''تعبیر و تحلیل'' میں یوں پیش کیا اقتباس ملاحظہ ہو:

''پریم چند کے بعد جس ادیب نے ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے دُکھوں اور محرومیوں کو فن کی موثر زبان عطا کی۔ جس نے متوسط طبقہ کی بورژوا اخلاقیات کو بے نقاب کیا وہ بیدی ہیں ناداروں، مظلوموں اور سماج کے دبے کچلے انسانوں سے گہری اور راست وابستگی کا جو احساس پریم چند کے یہاں ملتا ہے وہی بیدی کے آرٹ کا امتیازی وصف ہے وہ ایسا دردمند اور حساس دل رکھتے تھے کہ اگر

چاہتے بھی تو انسانوں سے یگانگت کے اس رشتہ کو توڑ نہ پاتے۔‘‘۱۰؎

ہراجندر سنگھ بیدی نے ایسی ہی صورتِ حال کو اپنے ناول ایک چادر میلی سی کا موضوع بنایا ہے۔ حد تو یہ ہوتی ہے کہ پھراسی کے دیور منگل سے شادی کرنے کی تجویز رکھی جاتی ہے۔ وہ منگل جس کو رانو نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ ہندوستانی سماج اور مذاہب میں اکثر ایسا ہوتا نظر آیا ہے مگر بیدی ناول ’’ایک چادر میلی سی‘‘ کے ابتدائی دور میں رشتوں میں شدید چاشنی پیدا کردیتے ہیں۔ پھر ان رشتوں میں بے ثباتی یا تغیر پزیری کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ جاتی۔ بیدی کی جدت نگاری کہیں کہیں کمزور نظر آتی ہے۔ وہ جدت نگاری کی دلدل میں پھنس کر ممتا کے رشتے، محبت وجذبات، فکر وفن کو بالائے طاق رکھ کر ان تمام رشتوں کو نئے زاویہ، نظریے سے دیکھنے کی ایک کمزور کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ کئی جگہ کرداروں کو غیر حاضر بنادیتے ہیں۔ پورے ناول میں تلوکا کا قاتل منتشر خیالی نظر آتا ہے۔ مگر آخر میں رانو اپنی بڑی بیٹی کی شادی اپنے شوہر کے قاتل سے کرانے پر کس طرح راضی ہوتی ہے؟ یہ شادی کن حالات میں ہوتی ہے؟ ان تمام تر پہلوؤں پر راجندر سنگھ بیدی ہمیں خاموش نظر آتے ہیں۔ جہاں تک رانو کے کردار کا سوال ہے تو وہ ایک مکمل ہندوستانی عورت کا مجسمہ کہلانے کے لائق ہے۔

حواشی:

۱۔ وارث علوی، راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، اشاعت ۲۰۱۸ء ص ۴۳۳

۲۔ راجندر سنگھ بیدی، ناول، ایک چادر میلی سی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی اکتوبر ۲۰۲۰، ص ۱۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۶

۴۔ ایضاً، ص ۱۷

۵۔ ایضاً، ص ۴۴

۶۔ ایضاً، ص ۵۹

۷۔ ایضاً ص ۵۹

۸۔ پروفیسر قمر رئیس، تعبیر وتحلیل، عفت پرنٹرس لال کنواں دہلی، سنہ اشاعت ۱۹۹۶ء ص ۱۰۶

۹۔ ڈاکٹر شمیم نگہت، تاثرات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، سنہ اشاعت ۱۹۹۵ء ص ۱۱۰

☆☆☆

Kalam-e-Firaq mein Sufiyana Anasir by Surya Prakash Rao (Research Scholar, Supervisor-Dr. Sanjay Kumar, Dept. of Urdu Allahabad University

سوریہ پرکاش راؤ (ریسرچ اسکالر،نگراں۔ڈاکٹر سنجے کمار، شعبہ اردو الہ اباد یونیورسٹی، پریاگراج)

کلام فراقؔ میں صوفیانہ عناصر

فراقؔ گورکھپوری اردو ادب کی دنیا میں وہ نام ہے جو اپنے آپ میں ہندوستان کے کسی ایک مذہب یا فرقے کا پابند نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے آپ میں پوری ہندوستانی تہذیب وتمدن نظر آتا ہے۔موصوف اردو ادب کی دنیا میں نہ صرف ایک غزل گو نظم گو، رباعی گو، اور نقاد کی حیثیت سے مسلم ہیں بلکہ اپنے دامن میں کہیں نہ کہیں صوفیانہ پہلو بھی سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔انہوں نے اردو ادب کو نہ صرف اردو، فارسی بلکہ ہندی سنسکرت اور انگریزی کے الفاظ اور نئے موضوعات سے بھی فیضیاب کیا ہے۔فراقؔ کو کسی ایک پہلو سے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں کے حامل ہیں۔رشید احمد صدیقی نے فراقؔ کے تعلق سے کیا خوب کہا ہے:

’’فراقؔ کے ذہن اور ذوق کو سمجھنے کے لیے ہم کو ان راستوں سے کسی قدر ہٹ کر سوچنا پڑے گا جو ہم نے اب تک اختیار کر رکھے تھے۔‘‘

(’’فراقؔ گورکھپوری ذات وصفات‘‘، مرتبہ مخمور سعیدی، ص۔115)

فراقؔ اصل میں عشقیہ شاعر ہیں۔لیکن ان کے مزاج اور تصورات وخیالات کو اگر تصوف کے پیرائے میں پرکھا جائے تو کہیں نہ کہیں ان کے کلام پر کچھ صوفی شعراء کے کلام کا اثر بھی نظر آتا ہے۔اور یہ ان سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔انہوں نے من وعن کسی شاعر کی تقلید نہیں کی بلکہ ان کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے مزاج کے مطابق شعر کہے۔جگن ناتھ آزاد نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ فراق نے جب اپنی آنکھیں کھولی تو اس وقت فضا میں اصغر، حسرت، جگر، اور فانی وغیرہ کی آواز میں گونج رہی تھیں۔فراقؔ صاحب کا کہنا تھا کہ:

’’میری کوشش رہی ہے کہ ایک بلند ترین، پاکیزہ ترین، اور خیر و برکت سے معمور کائنات کی تخلیق کروں اور اپنی شاعری کے ذریعے سے انسانیت کو گہرا اور بلند بناؤں۔‘‘

فراقؔ کے اس قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "Sufiaism" سے مراد صرف اپنے آپ کو خدا کے راہ میں فنا کر دینا ہی نہیں ہے بلکہ ایک صوفی شاعر اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی ان تمام چیزوں کو ایک عام انسان کے خیالات سے ہٹ کر ذرا مختلف طریقے سے اس پر غور وفکر کرتا ہے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور ناہمواریوں کو دور کرتا ہے۔ معاشرے میں افراد کے درمیان جو باہمی کشمکش ہوتا ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایک خوشنما ماحول پیدا کرتا ہے۔ اس کے لیے شاعر سب سے پہلے انسان کے دل کو ٹٹولتا ہے اور اپنی فلسفہ پیش کر کے ان کے درمیان پھیلی ہوئی غفلت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق: ''اصل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے۔''

مزید ہم فراق کے کلام کو 'sufiaism' کے زیر بحث لائے اس سے قبل ہم یہ معلومات حاصل کرتے چلیں کہ تصوف کیا ہے؟ جعفر رضا صاحب اپنی کتاب ''تصوف: نئے تناظر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تصوف کے معنی ومفاہم کے تعین میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں جن میں یہ نظریہ زیادہ مروج ہے کہ تصوف مادہ ''ص وف'' باب تفعل سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں خود کو صوفیانہ زندگی کے لیے وقف کرنا۔ یہ صورت دیگر اس کے معانی براہ راست مادہ اشتقاق یعنی ''ص وف'' سے وضع کئے جائیں تو'' صوف'' یعنی اون یا اونی کپڑا ہوں گے۔ تصوف کے معنی نفس پاک ہونا. انہوں نے تصوف کے تین منزل بتائیں ہیں پہلی آیات قرآنی کی تلاوت، دوسری منزل کتاب وحکمت کی تعلیم اور تیسری منزل نفوس کا پاکیزہ بنانا۔ انھیں تینوں منزلوں سے گزرنے پر تصوف کی تکمیل ہوتی ہے۔ (ص 22-20)

بقول خواجہ ابوالحسن:

''التصوف ترک کل خط النفس'' (یعنی تمام لذتوں کے ترک کرنے کو تصوف کہتے ہیں۔''

اپنے دل کو پاک صاف رکھ کر تصوف کے راستے پر چلنے والے کو ہی ''صوفی'' کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں: صوفیائے کرام کا کام'' میں صوفی اور اس کی حیثیت کے عنوان سے لکھا ہے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''صوفی صوف سے مشتق ہو یا صفا سے، وہ مذہبی اور اخلاقی عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ملک وملت سے بے نیاز ہے اور ہر قوم اور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ وہ ایک قسم کا باغی ہے۔ جو رسم و ظاہر داری کو، جو دلوں کو مردہ کر دیتی ہیں، روا نہیں رکھتا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو۔ وہ لفظ دیکھتا ہے اور یہ معنی کو۔ وہ رسمیات اور تقلید کا پابند ہے اور یہ ان سے بیزار۔ اس کی نظر برائی پر پڑتی ہے اور یہ برے سے برے

میں بھی بھلائی کا پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ لعن طعن سے کام لیتا ہے اور یہ مہر و محبت ہے۔ وہ سختی اور تشدد کرتا ہے اور یہ نرمی اور ملائمت۔ وہ بہت کم معاف کرتا ہے اور اس کا شیوہ درگزر کرنا ہے۔ وہ خودی اور خودنمائی سے بڑا بنتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری سے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے عیوب کا متجس رہتا ہے اور یہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے۔ وہ اپنے علم سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ اپنے عمل سے دوسروں کو لبھاتا ہے۔(ص۔۵)

فراقؔ کا ایک شعر دیکھیے:

اپنے مقام پر رہیں، عشق کی بے نیازیاں   گو درِ خلد بھی کھلے، دل نے کہا کہ کون جائے

ہمارے ادب میں عشق کی دو صورتیں ہیں پہلا عشق حقیقی اور دوسرا عشق مجازی۔ اکثر افراد کا خیال ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے معبود الٰہی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں یعنی اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے لیے وقف کر دے تو وہ عشق حقیقی ہے۔ اور جب ہم دنیاوی باتیں کرتے ہیں اور اپنے محبوب کی شوخی، نزاکت اور اس کے لب و رخسار، نازک اندام، اور اس کی سیاہ زلفیں وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں تو وہ مجازی عشق کے زمرے میں آتا ہے۔ فراق صاحب نے مذکورہ بالا شعر سے اس خیال کی وضاحت کی ہے کہ عشق اپنے جگہ پر عشق ہی ہوتا ہے چاہے وہ خدا سے ہو یا کسی نازنیں سے (نازنیں بھی تو خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہے اور ہر فرد کا دل خدا کا گھر ہوتا ہے یعنی خدا ہر جگہ موجود ہے ایسے میں اگر میرے لیے جنت کا دروازہ بھی کھلتا ہے تو میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ کیوں کہ خدا کا جلوہ تو ہر جگہ موجود ہے ایسے میں مرزا محمد رفیع سودا کا ایک شعر یاد آتا ہے:

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا   موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا

اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بھی ''عشق'' کا لفظ ہماری نظروں کے سامنے سے گزرتا ہے یا ہم کسی دوسرے اشخاص کی گفتگو میں اس لفظ کا ذکر سنتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً کسی حسین و جمیل، ماہ رو، نازک بدن، آخرین صورت، یعنی کسی خوب رو کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ہمارے خیالوں میں اس کا ایک حسین پیکر تیار ہو جاتا ہے اور چند لمحوں کے لیے ہم اپنے آپ کو ان حسین خیالوں میں مست و مخمور پاتے ہیں۔ پر میں بتا دوں کہ یہ جو عشق ہے ایک ظاہری عمل نہیں بلکہ ایک باطنی عمل ہوتا ہے۔ ظاہری عشق سے ہم صرف کسی خوبصورت شے کو دیکھ کر متاثر ہو سکتے ہیں محظوظ ہو سکتے ہیں۔ پر اندرونی عشق ہم انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ اور یہی عشق ہمیں کسی محبوبہ سے بھی ہو سکتا ہے، اور یہی عشق ہمیں اپنے والدین سے بھی ہوتا ہے، بہن سے بھی ہوتا ہے، بھائی سے بھی ہوتا ہے،

دوست سے بھی ہوتا ہے، اپنے استاد سے بھی ہوتا ہے، اور یہی عشق پرندوں کی آوازوں سے، آبشاروں کے شور سے، درختوں کے پتوں کے سرسراہٹ سے، کتابوں سے بھی ہوسکتا ہے، اور یہی عشق ہمیں اپنے خدا سے بھی ہوتا ہے (پر جو عشق خدا سے ہوتا ہے اس کا درجہ اور مرتبہ بلند ہوتا ہے، عام عشق کو تصوف کے زمرے میں نہیں لایا جاسکتا ہے۔) عشق کو محدود دائرے میں قید کرنا اپنی کم علمی کا اظہار کرنا ہے۔ عشق کے مفہوم کو سمجھنا عام فہم یا کسی کم علم انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ عشق کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے وسیع النظری، معطر ذہن، اور انسانی دل کا ہونا بہت ضروری ہے۔

مثلاً:

پوچھ ضمیر عشق سے راز خدا و اہرمن (فراقؔ)

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں عشق توفیق ہے گناہ نہیں (فراقؔ)

عشق کے آغوش میں بس اک دل خانہ خراب

حسن کے پہلو میں صدہا آفتاب ومہتاب (فراقؔ)

خدائے سخن میر تقی میرؔ کا کہنا ہے:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

ولیؔ نے بھی کیا خوب کہا ہے:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا کیا حقیقی وکیا مجازی کا

فقیر عشق کو کیا جامہ زیروں سے غرض یہی بہت ہے اگر چار گز کفن کے ملے (فراقؔ)

فراق گورکھپوری 28 / اگست 1896 کو ضلع گورکھپور کے بانس گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ ان کے والد صاحب عبرت گورکھپوری ایک شاعر اور وکیل تھے۔ فراق نے اپنی ذہنی خوبیوں سے اردو ادب کو خوب نوازا ہے ان کی شہرآفاق تصنیف ''گل نغمہ کے لیے ان کو 1969 میں سب سے بڑا ادبی انعام گیان پیٹھ دیا گیا۔ پدم بھوشن کا خطاب ان کو 1968ء میں، اور 1960ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ عطا کیا گیا۔

فراق گورکھپوری ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مدرس بھی تھے اور ایک لیکچرر کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی استاد بھی رہے ہیں۔ اور یہیں سے 1959 میں رٹائر بھی ہوئے۔ فراق کی شاعری میں عشقیہ پہلو کثرت سے ہیں ان کی رباعیوں میں تصوف کے اشعار بالکل بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی رباعیوں کا مجموعہ کلام "روپ میں ایک عورت کے حسن و جمال کی عکاسی کی ہے۔

انہوں نے میر کے طرز تحریر سے متاثر ہو کر دنیا کی فکر انگیز باتوں کا اظہار بھی کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

زندگی اس دور میں بشر کی　　بیمار کی رات ہو گئی ہے
زندگی کیا ہے؟ آج اسے اے دوست　　سوچ لیں اور اداس ہو جائیں
اے معنی کائنات مجھ میں آجا　　اے راز صفات وذات مجھ میں آجا
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے　　نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

مقالے کے اختتام پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ کلام فراقؔ میں تصوف کے اشعار کی کثرت نہیں ہے۔ پھر بھی کچھ حد تک فراق کے یہاں اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس پہلو پر فراق کے یہاں عشقیہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ان کا پورا کلام عشقیہ رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ میں اپنے اس مقالے کو مجنوں گورکھپوری کے اس قول پر ختم کرتا ہوں:

''فراقؔ جیسی چند جامع شخصیتیں روز روز نہیں پیدا ہوا کرتیں۔''

☆☆☆

افسانے Afsane

Zaviya by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800

وحشی سعید (سرینگر)

زاویہ

وہ رات بھی خوابناک تھی۔ستاروں نے ابھر کر جوانی اختیار کر لی تھی۔سنہرے قمقموں کی روشنی میں عریاں جسموں کی خرید وفروخت بے جان روحوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔رات کے اجالے کے دوسری طرف سیاہی میں انجان مسافروں کو لوٹا جارہا تھا۔بدی کی بانہوں میں کاروبار ہورہا تھا۔رات کی آغوش سے جب سورج کی روپہلی کرنیں نکل آیں،اس وقت بازار کا زاویہ مختلف تھا۔رات کے ڈاکو رنگ برنگ کپڑوں میں ٹہل رہے تھے۔دوکانیں سج گی تھیں،ان پر دبلے پتلے اور موٹے جسم والے سیٹھ بیٹھ چکے تھے۔زندگی کے ایک دوسرے زاویے کا کاروبار شروع ہو چکا تھا۔روز مرہ کی چیزوں کی خرید وفروخت کا بازار،جس میں ایک پوری دنیا آباد تھی۔یہاں ہر قسم کے لوگ تھے۔شریف، بدمعاش،عزت مآب خواتین،طوائفیں،اچھے اور برے سب سے بازار کی رونق تھی۔دوکانوں پر گاہکوں کا ہجوم تھا۔ان کی جیبوں میں مختلف قسم سے کمائے ہوئے روپئے تھے۔عجیب بازار تھا وہ،ہر قسم کی رنگینیوں سے مزین۔یہ دوسرے بازاروں سے مختلف بھی تھا اور پرکشش بھی۔اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی تہذیب تھی جو دوسرے بازاروں میں نہ تھی۔یہی وجہ تھی کہ کئی باہر کے دوسرے بازار جن پر اس کی خوش حالی سے اثر پڑتا تھا،نیی نیی سازشوں میں لگے رہتے۔یہ بازار کی زندگی کا ایک اور مختلف زاویہ تھا۔ایک دن روز کی طرح دن کے کاروبار میں گاہکوں کی پسندیدہ چیزوں کو پیک کیا جارہا تھا اوران کے پرس سے روپئے نکل کر دوکانداروں کی دولت میں اضافہ کر رہے تھے کہ بازار نے ایک دم مختلف زاویہ اختیار کیا۔کچھ لوگوں کی آپسی تو تو میں میں نے فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر لی،کچھ لوگ آمنے سامنے ہجوم کی شکل میں ایک دوسرے سے لوہا لے رہے تھے،تو عورتیں،بوڑھے،بچے اور دوسرے جوان جلد از جلد وہاں سے نکل جانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔دوکاندار بھی اپنی اپنی دوکانیں بند کر وہاں سے نکل جانے والوں میں شامل ہو گئے۔جب تک پولس آتی،چار لاشیں گر چکی تھیں اور کئی لوگ زخمی ہو کر موت اور زندگی کے درمیان ایڑیاں رگڑ رہے تھے

۔کچھ ہی دیر میں بازار میں سناٹا چھا گیا۔جب رات آئی تو دھیرے دھیرے دن کا سناٹا مختلف قسم کے ہجوم سے گلزار تھا۔دلال ،بسیائیں، بے جان روحوں والوں کا جاندار جسموں کی خرید وفروخت کرنا،دوسرے قسم کے گاہکوں کا ہجوم۔انجان مسافروں سے لوٹ،اچکہ گیری اور ہجوم کا فائدہ اٹھا کر جیبیں تراش لینے والے ماہر فنکار۔لیکن یہ ہنگامہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے بازار میں الگ قسم کا شور برپا کر دیا۔بات پھیلی کہ باہر والوں نے بازار کے اندر کے کچھ ایسے ذہنوں،جو کہ خود کو بازار کی مختلف زاویوں والی زندگی پر دادا قسم کا حکمراں سمجھتے تھے،سے مل کر فرقہ وارانہ فسادات کے بعد رات میں بھی بازار والوں پر یہ عنایت کی تھی ۔یہ بازار کی زندگی کا ایک اور مختلف زاویہ تھا ۔اس کے بعد دن اور رات میں نہ جانے کتنی وارداتیں ہویں۔فوج کو بازار میں آ کر مورچہ سنبھالنے کا بھی حکم دیا گیا۔ایک بار جو فوج بازار پر مسلط ہوئی تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس رات جب فوج نے بازار کے لوگوں کو امان بخشنے اور ماحول کو سازگار بنانے کے لیے بازار میں قدم رکھا تو باہر اور اندر کے دوسرے قسم کے لوگوں نے بھی کبھی ظاہری اور کبھی باطنی طور پر مورچہ سنبھالے رکھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بازار میں پھر کبھی صبح نہیں ہوئی۔یہ بازار کی زندگی کا تازہ ترین اور بے حد کربناک زاویہ تھا۔اب بازار والوں کو حقیقی صبح اور زندگی کے ایک نیئے زاویے کا انتظار ہے جو ان کے پرانے دنوں کو واپس لا کر ان کے غموں کا مداوا کر سکے۔

اب اس کا دل پتھر کا ہو چکا تھا۔جرم کرتے کرتے جرم کرنے کا احساس اب مردہ ہو کر ایک طرح سے زندگی جینے کے ایک سلیقے،ایک فرض کی صورت اختیار کر گیا تھا۔نہ جانے وہ کون سے حالات تھے،جس نے اسے ایسا بنایا تھا۔اس کی ہیبت بھی اتنی تھی کہ کوئی پوچھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی وہ زاروقطار روتا تھا،خاص طور سے کچھ مخصوص راتوں کو،لیکن اس بارے میں بھی پوچھنے کی کسی کو ہمت نہ تھی۔اس کے خاص دوستوں فضلو،کلو،للن اور شامو نے ایک بار اس بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں اتر آئے خون کو دیکھتے ہوئے انھوں نے گھبرا کر بات چیت کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔

نہ جانے کیوں وہ اپنا شکار ہمیشہ سرکاری کارندوں کو ہی اپنا نشانہ بناتا تھا۔کئی بار دوستو نے اس بابت بھی دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن جواب کے طور پر ہمیشہ اس کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ جاتی جس کے پیچھے غصے کا ایک شعلہ فشاں سمندر محسوس ہوتا اور یار دوست اس جواب سے بھی محروم رہے۔اس کے علاوہ عوام کو لوٹنے کا تصور بھی اسے شاید کبھی نہیں آیا۔دوستو کی اتنی ہمت

نہ تھی کہ اس کے ساتھ کے بغیر آپس میں مل جل کر بھی کسی لوت کو انجام دے سکیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہاں کی چاک و چوبند پولس کا انتظامیہ تھا جو حکومت کے کارکنوں جن میں کہ خود پولس کا عملہ بھی تھا، کے علاوہ سب کی حفاظت بہ حسن و خوبی انجام دے رہی تھی۔ جب پولس سرکاری برادری کی حفاظت میں ناکام رہی تو یہ ذمہ داری آر۔ پی۔ ایف۔ کو سونپ دی گئی جس کے ایک افسر دلیر خان کا یہ بیان آج کے اخبار کی سرخی کی زینت تھا کہ جب تک پچیس ہزار انعامی وہ اور اس کے گروہ کو یا تو زندہ پکڑ کر جیل میں سڑا دوں گا یا پھر کتے کی موت نہ مار ڈالوں گا تب تک یہاں سے اپنا تبادلہ نہیں ہونے دوں گا۔

'اچھا تو یہ ایک نیا حرامی پیدا ہوا ہے ہمیں پکڑنے کے لئے' شامو اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے غرایا۔

'یہ پولس کا نہیں، آر۔ پی۔ ایف۔ کا زفسر ہے، ہم سے شکست کھا کر حکومت نے پولس سے ذمہ داری چھین کر انھیں سونپی ہے' کلو نے شامو کی بات آگے بڑھائی۔

'کیا باتیں ہو رہی ہیں دوستو، آج وہ اپنے فطری دوستانہ رنگ میں تھا، شامو نے ساری بات بتائی۔

'یہ بھی ہمارا کیا بگاڑ لیں گے، جب جب حکومتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔' وہ من ہی من بڑ بڑایا۔

'کیا کہہ رہے ہو یار، ہم بھی تو سنیں'

'میں۔۔۔۔۔آگے کے پروگرام کا خاکہ تیار کر رہا تھا'

'لیکن اس سے پہلے اس حرامی کو سبق سکھانا چاہئے تا کہ انھیں احساس ہو کہ کیوں پولس کو ہٹا کر ہمیں پکڑنے کے لئے کیوں ان کو بلایا گیا ہے'

فضلو نے پہلی بار اپنی گرج دار آواز کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا۔

'بالکل، ہمیں اس طرح للکارنے والے اس پہلے کتے کو اس کی سزا ملنی چاہئے تا کہ آئندہ کوئی بھی حکومت کا غلام اس قسم کی جرأت نہ کر سکے'۔

للن نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

'اس کو بھی اپنے وقت پر سزا دے دی جائے گی یارو۔ ہاتھی چلتے ہیں، کتے بھونکتے ہیں'۔

'لیکن اس کے لہجے میں بھونکنے سے زیادہ کاٹ لینے کی بو آ رہی ہے۔ اس کا علاج تمہیں سب سے پہلے کرنا ہی پڑے گا'۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ 'وہ' نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی پستول کو کمر سے باہر نکال کر اسے جانچا اور دوبارہ کمر میں کھونس کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

’بابا، آج میں آپ کو ڈیوٹی پر نہیں جانے دوں گی۔ میری آنکھ بھی پھڑک رہی ہے اور دل میں قسم قسم کے خیال آ رہے ہیں‘۔

’میری پیاری بچی، ہمارے لئے یہاں ایک ایک دن قیمتی ہے۔ جس مقصد کے لئے میں نے زبردستی اپنا تبادلہ یہاں کرایا ہے، وہ جلد از جلد پورا ہو جائے تو فرض بھی ادا ہو اور روح جسم و روح کو سکون میسر آئے‘۔

’بابا میں آپ کے ساتھ زندگی بھر رہ سکتی ہوں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں‘۔

’لیکن میرے بعد۔۔۔۔ میری پیاری بچی، ہمیں سماج میں رہنا ہے۔ پھر تمہیں بھی بہترین زندگی گزارنے کا حق ہے اور اس کا انتظام کرنا میرا فرض‘۔

’لیکن بابا‘۔۔۔۔۔ ’مجھے مت روکو میری بچی۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ اب کہ قدرت ہمارے ساتھ ہے‘۔

’اپنا یار اس کتے کو نبٹا کر واپس آ گیا۔ چلو اسی خوشی میں جشن مناتے ہیں‘۔ شامو نے ’وہ‘ کو آتے دیکھ کر ساتھیوں سے کہا۔

’یار میں وہاں گیا ہی نہیں، کیوں کہ ایک زبردست خبر ملی جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ سرکاری خزانہ جہاں رکھا گیا ہے، وہ جگہہ اور اس تک جا کر کامیابی سے خزانہ لے کر حفاظت کے ساتھ واپس آ جانے کی پوری ترکیب میرے پاس ہے۔ پہلے یہ کام نپٹا لیتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے بعد آپ لوگوں کو دولت کمانے کی خاطر زندگی بھر کچھ نہیں کرنا پڑے گا‘۔

’اور تمہیں۔۔۔۔۔؟‘

’میں یہ کام دولت کمانے کے لئے نہیں کرتا۔ میرے اجداد کے پاس تو۔۔۔۔۔‘

’تو۔۔۔؟‘ ’چھوڑو یار، کام کی بات سنو۔ ترکیب یہ ہے۔۔۔۔۔‘

اس رات سارے کام ترکیب کے مطابق ہوئے۔ خزانہ لوٹنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ صرف چالیس پہرے داروں کو ایک خاص گیس کے ذریعہ سب کو ایک ساتھ بے ہوش کیا گیا۔ خزانہ لوٹنے کے بعد جب وہ حفاظت سے سڑک تک آ گئے تو وہ نے کہا۔

’دوستو، یہ شاندار کامیابی مبارک، اب تم لوگ یہ خزانہ لیکر ٹھکانے پر پہنچو میں اپنا وہ ادھورا کام کر کے آتا ہوں‘۔

’یار یہ وقت یہاں رکنے یا دوسرا کچھ کرنے کا نہیں ہے۔ سرکاری کتے ہماری تلاش میں کچھ ہی دیر میں

چپے چپے پر پھیل جائیں گے۔ پھر وہ کتا تمہیں آج کوئی اکیلے تھوڑی نہ ملے گا'۔

'باتوں میں وقت ضایع مت کرو۔ کیا اتنی بڑی کامیابی کے بعد بھی تم لوگوں کو میری صلاحیت پر شک ہو رہا ہے'۔

ان سے کچھ کہتے نہ بنا۔ دوسرے ہی پل سب 'وہ' کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد جب پولس کی ایک جیپ ادھر سے گزری تو اس نے خود ہاتھ دکھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔

'ارے، یہ تو 'وہ' ہے سب اپنی اپنی بندوکوں سے اسے نشانے پر لے لو۔ تم اب بچ نہیں سکتے 'وہ'۔

'حکومت کی کیا ہمت انسپکٹر کہ مجھے گرفتار کر سکے۔ میں نے تو تمہیں یہ بتانے کے لئے روکا ہے کہ وہ سرکاری خزانہ میں نے ہی لوٹا ہے۔ اور وہ کہاں ہے، یہ میں صرف آر۔ پی۔ ایف۔ کے افسر دلیر خاں کو ہی بتاؤں گا۔ مجھے وہاں تک لے چلو۔

انسپکٹر کا سر چکرا گیا۔ اسے کچھ کہتے نہ بنا۔ 'وہ' شیر کی طرح انکے پاس آیا اور ایک کانسٹبل کو اشارہ سے پیچھے کرتے ہوئے خود آگے والی سیٹ پر انسپکٹر کے بغل میں بیٹھ گیا۔ کسی کو اسے ہتھکڑی لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔ 'تم مجھے ہی خزانے کے بارے میں کیوں بتانا چاہتے ہو؟'

'حقیقت تو یہ ہے کہ میں تمہیں بھی اس خزانے کے بارے میں نہیں بتاؤں گا'۔

دلیر خان کے ساتھ پاس کھڑے دوسرے آر۔ پے۔ ایف۔ کے جوانوں پر حیرت طاری ہو گئی۔ 'پھر تم نے ۔۔۔۔۔۔' 'میں اس گیدڑ کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے شیر کے شکار کا ڈھنڈورا اخبار میں پیٹا تھا'۔ دلیر خان کے ساتھ وہاں موجود جوانوں کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا، لیکن کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اس نے دوبارہ کہا۔

'دیکھو، اپنے ساتھیوں کے پتے کے ساتھ ساتھ تم خزانے کا پتہ بھی بتا دو۔ ہم تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آئیں گے'۔ اس نے ایک زوردار مضحکہ خیز ٹھہاکہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

یہ ہنسی ان کے لئے نا قابل برداشت تھی۔ دلیر خاں کا اشارہ پاتے ہی سب اس پر پل پڑے۔ کچھ دیر بعد جب 'وہ' بے دم ہو کر گر پڑا، اسے پھر اٹھا کر کرسی پر بٹھایا گیا۔

'آخر تم لوگوں کی سرکاری ملازموں سے کیا دشمنی ہے؟'

'حکومتوں کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟' 'تم لوگوں کو اپنا نظریہ بدلنا پڑے گا'۔

'حکومتوں کو اپنی پالسی بدلنی پڑے گی'۔

'مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم خود حرام موت مرنے کے لئے ہمارے پاس کیوں آ گئے'۔

'مخصوص راتوں میں گریہ وزاری کا کرب اب برداشت نہیں ہوتا'۔اس نے دھیمے سے یہ کہا اور چہرے کا رنگ بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے اشکوں کے قطرے بھی چھلک پڑے۔

'لگتا ہے تمہیں اپنی بھول کا احساس ہونے لگا ہے۔چلو اب جلدی سے۔۔۔۔۔۔'

'میں تمہارے پاس اس لئے آیا کہ اپنی موت سے پہلے تمہارے پورے عملے کی موت شکست کی صورت میں دیکھ سکوں'۔'وہ' نے ان کی بات کاٹتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھائی۔

'یہ کیا بک رہا ہے تو'

'ابے گدھوں، جب میں خزانے کا پتہ تم لوگوں کو نہیں بتاؤں گا،تو تمہارا عملہ جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہے، وہ تو ناکام ہو جائے گا'۔

ایک بار پھر بنا کچھ کہے جوانوں نے اس پر لات،گھونسوں کی بارش کردی۔اس کے ناک اور منھ سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔جب جوان تھک کر ایک طرف ہو گئے تو دلیر خان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'نہ جانے کیوں تمہاری صورت کچھ یاد کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔کون ہو تم؟'

'اپنے چشمے کا نمبر بڑھوا بڈھے، مجھے دیکھ کر صرف تجھے اپنی موت یاد آنی چاہئے'۔

سامنے کھڑے جوان سے اپنے افسر کی یہ بےعزتی برداشت نہ ہوئی،اس نے ایک زوردار گھونسہ 'وہ' کے پیٹ میں مارا۔اس کے منھ سے خون کا ایک فوارہ نکلا اور وہ دوہرا ہو کر زمین پر تڑپنے لگا اُاسی واقت ایک جوان نے اندر آتے ہوئے دلیر خان سے کہا۔

'مبارک ہو سر۔حکومت نے آپ کی کامیابی پر آپ کو اس کے سر پر رکھے ہوئے پچیس ہزار کے انعام کے ساتھ دوسرے انعامات اور ترقی دینے کا بھی اعلان کر دیا ہے'۔

درد سے تڑپتے ہوئے 'وہ' کے منھ سے نکل پڑا۔'چلو،اب تم جیسے ایمان دار افسر کی بیٹی کی شادی اچھی طرح ہو جائے گی۔اور جو بچ جائے،اس سے تم اپنے جیسے دوسرے ایمان دار کی مدد کر دینا جو اپنا سب کچھ گنوا کر بھی حرام کی کمائی سے کوسوں دور ہو'۔

دلیر خان ششدر رہ گیا اُاس نے دوڑ کر اس کا سر اپنی بانہوں میں لے لیا۔'بیٹا،تم کون ہو؟'

'میں۔۔۔آپ کا۔۔۔نہیں۔۔۔آپ کی طرح کا۔۔۔نہیں آپ کی۔۔۔طرف۔۔۔کا۔۔۔'اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کر پاتا،موت نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

Ab kya hoga by Dr. Nazir Mushtaq (MBBS) (Srinagar) cell-9149984865

ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر)

اب کیا ہوگا

روپہ بابا میلے کچیلے   پھٹے پرانے   فرن میں ملبوس اپنی جگہ سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھ کر خرگوش کی طرح   قلانچیں بھرنے لگا۔۔۔اسے لال چوک کے سبھی دکاندار روپہ بابا کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ وہ ہر دکان دار سے صرف ایک روپیہ کا سکہ وصول کرتا تھا اس نے لال چوک کے ایک۔حصے کا چکر لگایا اور ہر دکاندار نے بنا پوچھے ایک روپے کا سکہ اس کے ہاتھ میں رکھا۔۔اس نے سکے ایک میلی تھیلی میں رکھے اور اسے گلے میں لٹکایا۔۔پھر چھلانگیں مارتا ہوا گھنٹہ گھر کے نیچے بنے ہوئے گول ٹھرے کے ایک طرف بیٹھ گیا۔میلا کچیلا فرن اس کے بدن کے نصف حصہ کو ڈھانپنے کے لیے کافی تھا باقی نچلا آدھا حصہ ننگا تھا۔لمبے بال داڑھی کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔اس نے اپنا موبائل حقہ سنبھالا ہی تھا کہ ایک ادمی دوڑتے ہوئے آیا اور اس کے لیے حقہ تیار کیا۔۔۔روپہ بابا نے اس کی جھولی میں دو تین ننگی گالیاں ڈال کر کہا۔دفع   دفع۔۔۔۔اور خود تمباکو کے کش لینے لگا۔۔۔۔اس نے بایں طرف دیکھا۔۔۔۔ٹریفک رکا ہوا تھا کوئی بھی گاڑی ایک سینٹی میٹر بھی ہل نہیں پا رہی تھی ریڑے والے اور سائیکل والے بھی پھنسے ہوئے تھے۔۔۔اسی ٹریفک جام میں مائیکروٹکلا بھی پھنسا ہوا تھا۔وہ اپنی لال رنگ کی برینڈ نیو گاڑی میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا ہو اس نے سگریٹ کا زوردار کش لگایا اور ریڈیو آن کر کے لتا منگیشکر کا گانا سننے لگا۔۔اچانک اس نے دایں طرف کے آیینہ میی دیکھا وہ دم بخود رہ گیا۔۔اس کی۔کار کے پچھلے حصے کے ایک طرف ایک انتہائی خوبصورت نیم برہنہ میم   گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی وہ اسے دیکھ کر حواس باختہ ہوا سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر کر اس کے پینٹ سے چپک گیا۔بڑی مشکل سے اس نے سگریٹ بجھا دیا مگر اتنی دیر میں سلگتا ہوا سگریٹ اپنا کام کر چکا تھا۔۔۔پینٹ میں سوراخ ہونے کا اسے زرہ بھر رنج نہیں ہوا اس نے پھر آیینہ میں دیکھا۔۔نوجوان میم کھڑی روپہ بابا کو گھور رہی تھی اور وہ بھی اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔۔۔روپہ بابا کی ناک لگاتار بہہ رہی تھی اور وہ حقہ سے برابر عشق کر رہا تھا۔۔اچانک اس پر کھانسی کا دورہ پڑا وہ اپنی

جگ سے یوں اچھل پڑا جیسے اسے کسی زہریلی ناگن نے ڈس لیا ہو۔۔۔میم نے اس کی بہتی ہوی ناک اوراس کے ننگے بدن کو دیکھ کر بھنویں چڑھا کر آنکھیں بند کرلیں۔۔۔۔مائیکروٹکلا یہ سب دیکھ رہا تھا۔۔اچانک روپہ بابا کھانستے ہوئے میم کے نزدیک گیا اور ایک وزنی تھوک اس کی طرف داغ دی۔تھوک میم کے عریاں سینے سے چپک گئی۔۔اسے دیکھ کر میم کو پہلے ابکای محسوس ہوئی پھر اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی پھر وہ پے در پے الٹیاں کرنے لگی اور چند لمحوں بعد کار کے پچھلے ٹایر کے نزدیک بے ہوش ہوگئی۔۔۔۔۔اچانک گاڑیاں حرکت میں اگیں اور ہر کوئی ایک دوسرے سے یوں سبقت لینے کی کوشش کرنے لگا جیسے صدیوں سے کسی زنداں میں قید تھے۔روپہ بابا دوڑتا ہوا پتہ نہیں کہاں غایب ہوگیا۔۔۔ مائیکروٹکلا گاڑی سے اتر کر بیہوش میم کے قریب گیا اس کی نبض ٹٹولی۔۔۔۔اومای گاڈ یہ تو شاک میں ہے۔۔۔اس نے جلدی سے میم کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے پھولوں سے بھری ایک ٹوکری سیٹ پر رکھ دی ہو۔۔۔۔وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے ایک انگریز نما نوجوان دوڑتا ہوا آیا اور مائیکروٹکلا سے پوچھا۔۔۔ارے اسے کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔پہلے دیکھنے تو دو ہمارے ہاوس بوٹ والی میم صاحبہ تو نہیں۔۔یہ سالیاں ایک جیسی ہوتی ہیں اس نے کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔۔۔نہی یہ کوی اور میم صاحب ہے مگر تم اسے کہاں لے جا رہے ہو۔۔۔۔ہاسپٹل اور کہاں۔ مائیکروٹکلا نے جواب دیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔۔۔۔اس نیسا مس نے لگے اپنے کو اس طرح ایڈجسٹ کیا کہ میم کا جسم اس کی نظروں کے سامنے رہے اس نے سگریٹ سلگایا اور گاڑی تیز رفتاری سے ڈرایو کرنے لگا وہ جلد از جلد اسپتال پہنچنا چاہتا تھا۔۔۔اس کا نام مائیکروٹکلا اس لیے پڑا تھا کہ چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کے سر پر برائے نام ایک بھی بال نہیں بچا تھا اور چوں کہ وہ اسپتال کے مائیکروبیالوجی شعبہ میں کام کرتا ہے اسی لیے اسے مائیکروٹکلا کا نام دیا گیا ہے۔۔اسے اپنے اس نام پر کوی اعتراض نہیں ہے اسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں وہ اکثر کہتا ہے عام لوگ کتوں کی طرح بھونکتے رہتے ہیں اور پھر کچھ تو لوگ کہیں گے لوگوں کا کام ہے کہنا۔۔۔وہ کسی کی پروا نہیں کرتا ہے۔وہ ہر وقت وہی کرتا ہے جو اس کا من کہے۔۔۔اس نے آئینے میں دیکھا میم بیہوش تھی مگر اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔۔۔اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور سوچنے لگا۔۔کتنی خوبصورت ہے یہ انگریز عورت بالکل ایک باربی ڈول ہے۔۔۔اور ایک وہ میری بیوی بالکل بھینس جیسی۔۔۔نہ شکل وصورت نہ عقل وشعور۔۔۔۔خواہمخواہ

میرے گلے پڑ گئی۔کیا کرتا مجبوری تھی اس کا باپ ایم ایل اے تھا مجھے مائیکرو بیالوجی میں داخلہ دلوایا اور پھر جہیز میں اتنی بڑی رقم۔شادی کرنی ہی پڑی۔۔ہاں کچھ کھوکر تو کچھ پانا ہے۔۔۔اس نے آیینہ میں میم کی طرف دیکھا وہ بدستور بیہوش تھی۔۔اس نے گاڑی کی رفتار تیز تر کردی۔۔۔ہیرا پھیری چوک پہنچنے سے پہلے ایک بوڑھے آدمی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔۔۔۔۔ارے صاحب کہاں جارہے ہو وہاں ابھی ابھی ایک گرینیڈ دھماکہ ہوا ہے پتہ نہیں کتنے لوگ مرگیے۔۔پولیس نے ہر طرف ناکہ بندی کر لی ہے۔اپ واپس جاو۔۔۔آگے خطرہ ہے۔۔۔۔۔مائکروٹکلا نے گاڑی موڑ لی اور سولو گراونڈ سے ہوتے ہوئے بابا ڈیمب روڈ پر پہنچا۔اچانک موسلا دھار بارش کے ساتھ اولے برسنے شروع ہوگئے۔۔وہ گھبرا گیا۔اسے بچپن ہی سے ایسی صورتحال سے ڈر لگتا تھا اس نے گاڑی ایک طرف پارک کر لی اور میم کو غور سے دیکھنے لگا۔۔بیچاری شاک میں چلی گئی۔اسے جلدی سے ہاسپٹل پہنچانا ہوگا۔۔۔بارش تھم گئی مگر صرف پانچ منٹ میں سڑک پانی میں ڈوب گئی۔۔اس نے سڑک پر جمع ہوئے پانی کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔۔۔یہ ہمارے انجینئر کیا کرتے رہتے ہیں یہ آر اینڑ بی ڈیپارٹمنٹ کتنی گہری نیند میں ہے۔۔پانچ منٹ بارش اور سیلاب۔۔۔۔۔۔پھر خود سے مخاطب ہوکر کہا۔۔۔بہتر ہے جلدی سے ہاسپٹل پہنچوں۔۔۔۔۔وہ تیز رفتاری سے گاڈی چلا نے لگا۔۔۔۔۔۔۔

اس نے اسٹیٹ اسپتال کی کار پارکنگ میں گاڑی پارک کی اور ٹرالی یا ویل چییر کا انتظار کیے بغیر بیہوش میم کو کاندھے پر اٹھایا اور ایمرجنسی روم کی طرف چل پڑا۔۔۔میم کو بیڈ پر لٹا کر اس نے ڈیوٹی پر ڈاکٹر سے کہا۔۔۔ڈاکٹر یہ عورت بیہوش ہوگئی ہے شاید شاک میں ہے اسے پلیز دیکھ لیجئے۔

ڈاکٹر نے مریضہ کا معائنہ کرکے کہا۔۔یہ تو شاک میں ہے۔۔یہ آپ کی کیا لگتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔یہ میری کچھ نہیں لگتی ہے ایک پاگل نے اس کے سینے پر تھوکا اور یہ بیہوش ہوگئی۔۔کیا۔۔۔۔۔ڈاکٹر حیران ہوگیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کسی کے تھوکنے سے بیہوش ہوگئی۔۔۔واہ کیا عجیب بات ہے Anyway۔۔۔مجھے لگتا ہے یہ میڈیکو لیگل کیس ہے پولیس کو اطلاع دینی پڑے گی۔۔۔ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔۔جاو پولیس کو فون کرواور نرس سے کہو کہ اس مریضہ کو جلدی سے ڈرپ لگاے اور تم اس کا کیس شیٹ بناؤ میں دوایاں لکھ دیتا ہوں۔۔۔۔۔

نزدیکی پولیس اسٹیشن سے تھانیدار رحمت خان اور کانسٹیبل چالو سنگھ آگیے اور مائیکروٹکلا سے کہا ہے۔۔۔۔۔چلیے تھانے چل کر بات کرتے ہیں۔۔۔تھانیدار نے کہا اور مائیکروٹکلا کو ساتھ لے

گئے۔۔۔۔ڈاکٹر نے بیہوش میم کا علاج شروع کیا۔۔۔اسپتال سے باہر سڑک پر پولیس کے ساتھ چلتے ہوئے مائیکروٹکلا سے مخاطب ہوکر ایک دکاندار نے کہا۔۔۔۔کیوں صاحب وہ میم کون تھی جسے آپ کاندھے پر اٹھا کر اندر لے جارہے تھے۔۔۔تھانیدار نے جواب دیا۔۔۔تم کیا پولیس کمشنر ہو اپنے کام سے کام رکھو۔تم کیوں پوچھ گچھ کر رہے ہو وہ کیا تمہاری بہن لگتی ہے۔۔۔۔دکاندار کھسیانا ہوکر سر جھکائے بالوں کو کھجلانے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔رحمت خان کرسی پر بیٹھ گیا اور چالو سنگھ سے کہا۔۔۔چالو چائے منگواو۔۔۔۔اور پھر مائیکروٹکلا سے مخاطب ہوا۔۔۔ہاں تو کیا نام ہے تمہارا۔۔۔۔مائیکروٹکلا نے صاف وشفاف سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔جواب دیا۔۔۔جی میرا نام مائیکروٹکلا میرا مطلب ہےلوگ مجھے مائیکروٹکلا کہتے ہیں

لوگ جائیں باڑ میں۔۔۔۔رحمت خان نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر۔۔۔۔ماچس تلاش کرنے لگا

تمہارے پاس ماچس ہے۔۔۔اس نے سامنے کھڑے مائیکروٹکلا سے کہا۔۔۔۔اس نے جیب سے لائٹر نکال کر رحمت خان کے سامنے رکھ دیا۔۔اس نے سگریٹ سلگا کر لائٹر جیب میں رکھ دیا۔۔۔چپراسی چائے لے کر آیا۔۔۔اس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔۔ہاں تو کیا نام ہے تمہارا۔۔۔۔مائیکروٹکلا نے کچھ سوچ کر کہا۔۔۔۔میرا نام ڈاکٹر عاصم علی بٹ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

اوتو آپ ڈاکٹر ہیں۔ بیٹھیے۔۔۔اچھا یہ بتائیے کہ آپ کون سے ڈاکٹر ہیں۔۔پی ایچ ڈی یا۔۔۔میڈیکل ڈاکٹر۔۔۔ایلوپیتھک یا ہومیوپیتھک۔۔یا۔۔اصلی ڈاکٹر نقلی ڈاکٹر۔۔۔میرا مطلب ہے۔کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔مائیکروٹکلا نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔جناب میں مائیکروبیالوجی کا ڈاکٹر ہوں۔۔۔

اوہ مائیکروبیالوجی۔۔۔کام کیا کرتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔تم تنخواہ کس چیز کی لیتے ہو۔۔۔۔۔

مائیکروبیالوجی میں بڑے بڑے ٹیسٹ کیے جاتے ہیں۔۔۔

اوہ توتم ٹیسٹ کرتے ہو۔۔۔۔۔اچھا یہ بتاؤ اس بیہوش میم کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے۔۔۔۔

میرا اس کے ساتھ کوی رشتہ نہیں ہے وہ بیہوش ہوگئی میں اسے ہاسپٹل لے آیا۔۔۔

سچ سچ بتاؤ اصلی ماجرا کیا ہے ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سچ یہی ہے کہ۔ایک پاگل نے اس کے سینے پر زور سے تھوکا اور وہ بیہوش ہوگئی ۔۔۔
کلک کیا۔۔کیا۔۔پاگل نے اس کے سینے پر تھوکا اور وہ بیہوش ہوگئی ارے۔۔۔۔ٹکلا یہاں تو ہر کوئی ایک دوسرے پر تھوکتا رہتا ہے کوئی بیہوش نہیں ہوتا ہے۔۔۔۔۔میں آخری بار کہتا ہوں کہ سچ سچ اپنی رام کہانی بیان کرو۔۔۔۔ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔
اسپتال میں میم کو ہوش آیا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔۔۔۔۔۔میں کدھر ہوں۔۔۔۔۔۔۔نرس نے سنا تو وہ حیران ہوگئی۔۔۔۔۔ارے یہ تو اردو بول رہی ہے۔۔۔۔۔۔میم نے جواب دیا۔۔۔۔۔ہاں میں اردو بول سکتی میں کاشمیر میں راہتی ہوں۔۔۔۔۔۔مجھے یہاں کون لایا۔۔۔۔۔۔
نرس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔۔۔۔۔۔ساری کہانی سن کر اس نے نرس سے کہا۔۔۔میں پولیس اسٹیشن جانا چاہتی ہے۔۔۔۔
پولیس اسٹیشن پہنچ کر اس نے تھانے داد سے سب کچھ کہہ دیا اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں پولیس اسٹیشن سے باہر آنے۔۔۔۔۔۔
ایک مقامی ریسٹورنٹ میں وہ دونوں کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ڈاکٹر نے اسے سب کچھ بتا دیا۔۔۔۔۔میم نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔۔۔۔۔ Thank you very much for saving My life
آپ کا بہت بہت شکریہ۔۔۔۔
ارے آپ اردو بول سکتی ہیں
ہاں میں چار سال سے یہاں رہتی ہوں۔۔میں امریکہ کیلیفورنیا سے ہوں اور یہاں ریسرچ کررہی ہوں۔۔مجھے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا نے ریسرچ کے لیے ٹاپک دیا ہے۔۔۔۔۔۔ Effect of turmoil on local language.......اور میں کشمیری زبان پر ریسرچ کر رہی ہوں کہ ٹورمایل سے اس زبان پر کتنا گہرا اثر پڑا ہے۔۔۔۔۔
تو کیا لگا آپ کو۔۔۔۔۔۔۔کشمیری زبان کو بہت بڑا Damage ہوا ہے۔۔۔۔۔ٹورمایل سے نہیں بلکہ خود یہاں کے لوگوں کی وجہ سے۔۔۔۔۔یہاں کی جو New generation ہے وہ اپنی مادری زبان کو بھول گئے ہیں اور ایک الگ زبان میں بات کرتے ہیں جو اردو اور کشمیری کا مکسچر ہے۔۔۔۔ڈاکٹر اسے دیکھے جارہا تھا اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے سامنے دنیا کی

خوبصورت ترین عورت بیٹھی ہو وہ اسے اپنی بیوی سے compare کر رہا تھا۔۔۔۔۔اسے میم کی ریسرچ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ چاہتا تھا کہ میم اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں کرے کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ جائے۔۔۔۔۔اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔۔۔۔۔۔۔اوکے۔آج شام کیا پروگرام ہے۔۔۔۔۔کیوں نہ ہم آج ڈنر ایک ساتھ کریں۔۔۔۔۔۔
میم نے خوش ہو کر جواب دیا۔۔۔بہت اچھا رہے گا مگر ڈنر میری طرف سے ہوگا ہوٹل۔وکٹوریا میں جہاں میں رہتی ہوں
اوکے جیسے تمہاری مرضی۔۔۔۔۔ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
شام کو ڈاکٹر نے کپڑے بدلے اور پورے بدن پر مہنگا پرفیوم چھڑکا اور باہر کی طرف چلنے لگا۔۔۔سامنے بیوی کھڑی تھی
یہ آج بن ٹھن کر کہاں جا رہے ہو۔
ایک مقامی ہوٹل میں کانفرنس ہے اسی میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔کس ہوٹل میں۔۔۔۔بیوی نے مشکوک ہو کر پوچھا
وہ وہ ہوٹل اے ون۔۔۔میں۔۔۔۔
ڈنر وہاں ہی کرو گے۔۔۔۔۔
ہاں شاید مجھے دیر ہو جائے تم ڈنر کر کے سو جانا۔۔۔یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور اس کی بیوی دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے کسی گہری سوچ میں ڈوب گ ٔ۔۔۔
ہوٹل وکٹوریہ کے کمرہ نمبر 101 میں وہ دونوں امنے سامنے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔۔
میم نے پیار سے پوچھا ویل ڈاکٹر کیا پینا مانگتا ہے
وہسکی۔۔۔ڈاکٹر نے فوری جواب دیا
میں وہسکی نہیں پیتی ہوں
آج پی لو
نہیں تم پی لو میں کرین بری جوس پی لوں گی۔۔۔
اوکے۔۔۔۔۔میں آپ کے لئے وہسکی آرڈر کرتی ہوں اور اس کے ساتھ گرلڑ چکن بھی۔۔۔۔۔۔
ڈاکٹر نے وہسکی کی بوتل خالی کی اور ڈگمگانے لگا۔۔اس نے۔میم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔۔تم بہت خوب صورت ہو بالکل ایک پری کی طرح۔میں نے آج تک تم جیسی حسین عورت نہیں دیکھی

ہے۔۔۔۔مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔۔۔۔۔میم نے جوس پیتے ہوئے کہا۔۔۔۔مجھے بھی آپ سے محبت ہوگئی ہے کیونکہ آپ نے میری جان بچائی میں ہول لایف آپ کو یادرکھوں گی اور پیار کروں گی۔۔۔۔۔

اومیری باہوں میں۔۔۔۔۔۔میں تمہیں۔۔۔۔۔kiss کرنا چاہتا ہوں وہ لڑکھڑاتے ہوے اس کی طرف بڑھا۔۔۔۔۔میم پیچھے ہٹ گیی۔۔۔اپ نشے میں ہیں۔۔اپنے آپ کوسنبھالنے کی کوشش کریں

اوکم ان۔۔۔بنومت میں تمہارے ساتھ enjoy کرنا چاہتا ہوں

نونو میری منگنی ہوچکی ہے میں کسی غیر مرد کے ساتھ۔۔۔۔نونو۔۔۔۔۔۔۔

اوکم آن میری تو شادی ہوچکی ہے۔۔۔۔۔نو پرابلم۔۔کم آن

نونو ہم لوگ منگنی کے بعد کسی اور کے ساتھ سیکس انجوائے نہیں کرسکتے ہیں۔۔پلیز یہاں سے چلے جاؤ

نہیں۔۔۔۔میں نہی جاوں گا آج رات تم میری ہوا جا میری باہوں میں۔۔۔۔۔ای لو یو

میم۔نے چلا کر کہا۔۔بٹ آی ہیٹ یو۔۔۔۔۔۔۔وہ دروازے کی طرف جانے لگی مگر ڈاکٹر نے اسے روکا اور اپنی باہوں میں بھینچ لیا اور زبردستی اس کے ہونٹوں کا بوسہ لینے لگا۔۔اچانک میم کی نظر کھڑکی پر پڑی۔اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس سے چھڑایا اور سیدھے کھڑکی کی طرف دوڑی اور اچانک کھڑکی سے کود پڑی۔۔۔۔۔ڈاکٹر تیزی سے کھڑکی کی طرف گیا اور دیکھا۔ میم نیچے اوندھے منہ پڑی تھی۔۔۔۔۔۔وہ۔لڑکھڑایا اور صوفے پر گر پڑا۔۔۔۔داینے ہاتھ کی ہتھیلی کو زور سے اپنے ماتھے پر دے مارا۔۔۔۔۔اور اپنے آپ سے کہا۔۔اب کیا ہوگا۔۔۔۔

☆☆☆

نظمیں Nazmein

Parvin Shere (USA)
پروین شیر (امریکہ) cell-0016506565271

خواب زار Dreamland

کھلا کھلا وہ آسماں
یہ خواب زار سی زمیں
فراز کوہسار کی جبیں پہ شمس کی دراز انگلیوں کے نرم لمس
نیلگوں فلک کے بحر بے کراں پہ سرمئی
سفید بادلوں کی تیرتی ہوئی سی کشتیاں
سکوت کے لبوں پہ کچھ کہانیاں
یہ نغمہ سنج آبشار، نم ہوا
گلوں کے سرخ، ریشمی لبوں کو چومتی ہوئی
وہ کوہ کے بدن پہ ابر کی ردا
وہ دھند میں گھنے شجر کے سلسلے
کبھی عیاں کبھی نہاں
نگاہیں سن رہی ہیں جیسے کوئی دل ربا غنائی گیت
اس حسین خواب سی لطافتوں نے چھولیا ہے دل
کہ روح میں پگھل کے بہہ رہا ہے لمس کا نشہ
یہ خواب گر حسیں سماں
فسوں زدہ یہ دل مرا
ہوا کہ دوش پر اُڑا
حسیں جہاں میں کھو گیا! ☆☆☆

تخلیق تخیل Creation of Fancy

فلک کے نیلے طاق پر رکھے
دیے نے روشن آنکھیں موندیں
کالی مخمل کی چادر نے دھیرے سے باہیں پھیلائیں
وہ اس کی آغوش میں سمٹی، تھم کر سوئی
نیند میں ڈوبی اس کی آنکھوں نے چپکے سے
دروں میں ایک دنیا کے در کا تالا کھول کے پٹ کھولا تو
اس نے دیکھا۔۔۔
پھولوں کے نازک عارض پر کانٹوں کے نوکیلے
لب تھے
ٹھنڈے چشمے، تپتے پتھر، جنگل، چمگادڑ، تاریکی
پگ ڈنڈی پر اترتے جگنو
ہنستے روتے چہرے ہر سو

فلک کے تیرہ طاق پہ رکھے دیے نے اپنی آنکھیں کھولیں
نوری چادر نے ذریں باہیں پھیلائیں
جاگ کے اس نے بیرونی دروازہ کھولا
یہاں بھی ہر سو وہی سماں تھا!
ٹھنڈی، تپتی، پھولوں، کانٹوں
چمگادڑ، جگنو کی دنیا رواں دواں تھی
سوئی جاگی آنکھوں کی دونوں دنیائیں
خلاء کے کورے کاغذ پر بس
اس کے تخیل کی فنکاری تھی کاغذ تو سادہ ہی تھا!

کالاسمندر The black sea

اپنے خونخوار جبڑوں کو کھولے ہوئے
وہ دبے پاؤں ساحل کی جانب
بڑھا آ رہا ہے!
جہاں ریت کے خوبصورت گھروندے
بنانے میں بچے مگن ہیں
حسیں سیپیوں کے چمکتے
دھنک رنگ سے جگمگاتے
ہوئے ریت کے ذرے ذرے
گھروندے نہیں یہ ہزاروں
ستاروں کا جھرمٹ ہوں جیسے
یہاں چارسو مخملی سبزہ زاروں
پہ اڑتی ہوئی تتلیاں وجد میں
جھومتے سرخ پیلے
ہرے لہلہاتے ہوئے پھول پتوں سے
اٹھکیلیاں کر رہی ہیں
یہ ساحل پہ بکھرے ہوئے
رنگ سرشار ہیں اپنی تابانیوں میں
انہیں کچھ خبر ہی نہیں چپکے چپکے
وہ کالا سمندر بپھرتا ہوا
اپنے خونخوار جبڑوں کو کھولے ہوئے
قریب آ رہا ہے۔۔۔!

☆☆☆

نصف شب
In the middle of the night

دور بحر فلک پہ شکستہ بدن
چاند آدھا ادھورا ہے کھویا ہوا
کرچیاں آ گری ہیں زمیں پہ سمندر کی آغوش میں
ریزے ریزے ہیں لہروں پہ بکھرے ہوئے
جیسے رقصاں سر آب چنگاریاں
یاد ایام رفتہ کی ہیں
یا کوئی شیشۂ خواب ہے منتشر
پارہ پارہ تلاطم پہ بہتا ہوا
یا نوشتہ ہے آب رواں پر فسوں گر فسانہ کوئی
خامۂ نور سے
ایک جشن چراغاں سمندر پہ ہے
اور پھر۔۔۔
اُڑ کے آئی ہیں دامن میں چنگاریاں
چبھ گئی ہیں گلابوں پہ احساس کے
خواب کی کرچیاں
چن رہی ہے نظر پانیوں پہ چمکتے ہوئے
لاکھ الفاظ بکھرے ہوئے
وہ فسوں ساز افسانے لکھے ہوئے!

☆☆☆

گوشہ

روبینہ میر

Rubina Mir
W/O Mohd. Farid (Rtd. SSP)
Near Dak Bangalow
Post Office- Mandi
Tahseel- Mandi
District- Poonch-185102
(Jammu & Kashmir)
cell-7006056715
Email: rubinamir@gmail.com

آغانیاز مگسی (بلوچستان)

روبینہ میر صاحبہ: تلاش ذات کی شاعرہ

روبینہ میر صاحبہ ایک ایسی شاعرہ ہیں جن کی زندگی کا زیادہ تر وقت اپنے آپ کو یا اپنی ذات کو تلاش کرنے، اپنے دل کو ڈھونڈنے اور مظلوم عوام کے ساتھ ساتھ خاص طور پر مظلوم اور بے بس خواتین کے جائز حقوق کے بارے میں جدوجہد کرتے گزر رہا ہے جس کے لئے ان کو ہر قسم کی مشکلات اور امتحانات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ زندگی کی تلاش میں تنہا چل پڑی ہیں جن کی راہ میں کوئی سایہ دار شجر بھی نہیں ہے۔ لیکن ان کی بہت بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ان کے خاوند محترم کا قدم قدم پر ساتھ رہا ہے ورنہ وہ جس مقام پر آج کھڑی ہیں شاید اس مقام پر کبھی بھی نہ پہنچ پاتیں جس کا وہ خود بھی اعتراف کرتی ہیں۔

روبینہ صاحبہ کا اصل نام روبینہ اختر میر ہے۔ قلمی نام روبینہ میر اور تخلص روبینہ ہے وہ 15 اگست 1969 کو (خط پیر پنچال میں واقع) ضلع پونچھ کے ایک سیاحتی مقام چھتہ پانی میں پیدا ہویں۔ صوبہ جموں کے ضلع راجوری میں واقع گاں ''بھروٹ۔ کھبلاں'' ان کا آبائی گاؤں ہے۔ تعلیمی سفر کا آغاز گورنمنٹ پرائمری اسکول کھبلاں سے کیا۔ چھٹی جماعت میں گونمنٹ مڈل اسکول راجدھانی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے مڈل پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہای اسکول بھروٹ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہایر سکینڈری اسکول تھنہ منڈی سے بارہویں جماعت نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کی۔ تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے ڈگری کالج راجوری میں داخلہ لیا۔ لیکن باقاعدہ تعلیم مکمل نہ ہوسکی۔ چنانچہ 1993 میں محکمہ تعلیم میں ٹیچر کی حثیت سے ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں مواصلاتی تعلیم کے ذریعے جامعہ اردو علی گڑھ سے بی۔ اے۔ اور بی۔ ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت گورنمنٹ بوایز ہایر اسکینڈری اسکول راجوری میں ماسٹر کی حثیت سے تعینات ہیں۔

ادب اور دین داری کا خانگی ماحول انہیں اپنے دادا مرحوم الحاج عبدالرحیم میر کے بعد اپنے والدین سے وراثت میں ملا۔ ان کے نانا مرحوم کامریڈ غلام قادر میر، سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی شخصیت کے طور پر ریاست بھر میں مشہور و معروف تھے۔

1993 میں ان کی شادی پونچھ کے ایک نامی گرامی گھرانے میں مرحوم خواجہ غلام رسول (

منڈی پونچھ) کے صاحبزادے محمد فرید سے ہوی۔ جو اس وقت درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ جو بعد ازاں Kps کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے محکمہء پولیس میں آفیسر تعینات ہوے۔ اور کامیابیوں کی سیڑھیاں طے کرتے ایس۔ایس۔پی کے عہدے تک پہنچ گئے۔ شادی کے بعد ان کے سسرال میں بھی ان کو اسی طرح کا دینی ماحول ملا۔ ان کو تخلیقی سفر میں ان کے سرتاج یعنی شوہرِ نامدار (ایس۔ایس۔پی) فرید صاحب کی رفاقت شاملِ حال رہی۔ ورنہ یہ دشوار گزار مرحلہ طے کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ربِ دوجہاں کی اس عنایت اور بخشش کے لئے جس قدر بھی شکر بجالاؤں کم ہے۔ اور اپنے محسنوں کی طرف سے ملنے والے حوصلوں کے لئے اُن کی احسان مند ہوں۔ عام طور پر جس شاعر یا شاعرہ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ان کو شاعری کا شوق کب پیدا ہوا تو جواب ملتا ہے کہ مجھے شاعری کا شوق بچپن سے تھا اور بچپن ہی سے شاعری شروع کی لیکن روبینہ میر صاحبہ اور خواجہ ثقلین صاحب کے بارے میں یہ دلچسپ انکشاف ہوا ہے کہ انہوں نے بچپن کی بجائے بڑے پن میں شاعری شروع کی ہے۔ خواجہ ثقلین صاحب نے 54 سال کی عمر میں 2017 میں جبکہ روبینہ میر صاحبہ نے 43 سال کی عمر میں 2012 سے شاعری شروع کی۔ جن کی پہلی نظم "وطن کی بیٹیوں کے نام" کے عنوان سے روزنامہ اڑان میں 2012 میں شایع ہوئی۔ جس کے بعد وہ کبھی خود کو ڈھونڈنے نکلیں تو کبھی اپنے لاپتہ ہونے والے دل کی تلاش میں اور کبھی زندگی کی تلاش میں تنہا چل پڑی ہیں۔ جس طرح وہ کہتی ہیں کہ :

میں نے سوچا بھی نہ تھا میں ڈھونڈتی رہ جاؤں گی
خواہشوں کی بھیڑ میں دل لاپتہ ہوجائیگا

چونکہ ہمارے معاشرے میں مرد اپنے آپ کو آزاد و خود مختار اور عورت کو پابند سمجھتا ہے خود تو خواہ کچھ بھی کرتا پھرے اس سے عورت پوچھ نہیں سکتی لیکن عورت کو قبیح رسم و رواج میں جکڑا گیا ہے جس کو بس مرد کے ہر ظلم و جبر، زیادتیوں اور ناانصافیوں پر سر جھکا کر خاموش رہنا ہے۔ اسی تناظر میں روبینہ میر صاحبہ نے عورت ذات کی نمائندگی کرتے ہوئے کیا خوب کہا کہ:

میں قید ہو کے رہ گئی رسم و رواج میں ڈالی جو اس نے پاؤں میں زنجیر کیا لکھوں

لیکن اس کے باوجود یہی عورت سب کا بھلا چاہتی ہے اور بلا امتیاز مذہب و ملت، جنس ، زبان اور تہذیب وثقافت اور تمدن کے دعا مانگتی نظر آتی ہے۔ روبینہ میر کا کہنا ہے کہ:

میسر ہو سب کو سکوں زندگی کا میں سب کیلئے یہ دعا مانگتی ہوں

روبینہ صاحبہ کے اب تک 5 شعری مجموعے چھپ کر قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں جن میں " آئینہ خیال "2013 میں " تفسیر حیات "2016 میں " حرف راز " 2017 میں جبکہ ایک شعری مجموعہ کشمیری زبان میں "نوید قلم" کے نام سے 2019 میں اور" اضطراب" 2021 میں شایع ہوا ہے۔اس کے علاوہ بھارت کے مختلف اخبارات اور رسائل میں ان کی غزلیں نظمیں اور مضامین وغیرہ شایع ہوتے رہتے ہیں۔ان کے پسندیدہ شعراء میں مرزا اسداللہ غالب اور علامہ محمد اقبال شامل ہیں ان کی پسند سے مجھے یاد آیا کہ ڈاکٹر لبنیٰ آصف صاحبہ کی طرح روبینہ میر صاحبہ کی پسند کے شعراء کی فہرست میں بھی کوئی خاتون شاعرہ شامل نہیں ہے۔روبینہ میر صاحبہ کہیں ظلم و جبر اور ناانصافیوں کے خلاف توانا آواز بن رہی ہیں تو کبھی اور کہیں اپنی تعمیر حیات اور تکمیل ذات کی غرض سے کچھ معصوم سی خواہشات کا اظہار کر رہی ہوتی ہیں۔ان کی خوبصورت شاعری سے کچھ انتخاب آپ کی نذر کر رہا ہوں

پرانا زخم سلنا چاہتی ہوں — میں اب خود سے ہی ملنا چاہتی ہوں
ہوائے عشق چھو میرے بدن کو — میں بھی پھولوں سا کھلنا چاہتی ہوں

کبھی تم دیر مت کرنا

میں روٹھوں تو منانے میں — مجھے واپس بلانے میں
چراغ دل جلانے میں — اندھیروں کو مٹانے میں
دیار دل سجانے میں — کہ میرے پاس آنے میں
کبھی تم دیر مت کرنا
جہاں ہر گام پر مشکل کھڑی تھی — میں ان راہوں پہ تنہا چل پڑی تھی

آ ہی جائے گا آتے آتے ہی — میرے دل کے قرار کا موسم
کس قدر دل کو زخم دیتا ہے — گردش روزگار کا موسم
عمر بھر میں کہ الجھتی ہی رہی ہوں خود سے — زندگی تو نے مجھے اپنا بھی ہونے نہ دیا
مجھ کو تو اس کی ذات سے امید بڑی تھی — افسوس! اسے اپنی ہی شہرت کی پڑی تھی
مانا کہ ایک چھت کے تلے ہم رہے برسوں — لیکن ہمارے درمیاں دیوار کھڑی تھی

☆☆☆

Rubina Mir aur uski shairi by Wali Mohd. Aseer Kishtwari, Kishtwar

ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی (کشتواڑ)

روبینہ میرؔ اور اس کی شاعری

روبینہ میرؔ راجوری، پونچھ اضلاع کی ابھرتی ہوئی ایک خوبصورت شاعرہ ہے جس کا کلام آئے دن اخبارات، رسائل وجرائد اور کتابوں میں شائع ہو رہا ہے۔ میں گذشتہ چند برسوں سے ان کی تخلیقات پڑھتا رہا ہوں مگر ہماری روبرو ملاقات گذشتہ سال مارچ کے مہینے میں راجوری میں ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام "لٹریری فورم" کے دوران ہوئی۔ روبینہ میر نے اس پروگرام میں اپنی ایک اردو غزل کا کشمیری ترجمہ پڑھ کر کافی داد و تحسین پائی۔ پروگرام کے اختتام پر وہ قریب آئیں اور اپنے شعری مجموعہ " آئینہ خیال" کا ایک نسخہ تحفتاً میرے سامنے رکھا۔ شاید ہر تخلیق کار کی طرح انہیں بھی امید تھی کہ میں اس خوبصورت شاعری کے خوشنما مجموعے سے متعلق کوئی مضمون تحریر کروں۔

بدقسمتی سے میں ذاتی مصروفیات کی بنا پر آج تک اس کتاب کو پورے انہماک سے نہ پڑھ سکا۔ لہٰذا مضمون یا مقالہ لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس ضمن میں مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے خطہء پیرپنچال میں لگاتار ایک سے بڑھ کر ایک صاحب قلم پیدا ہوئے ہیں، جس میں شاہباز راجوروی، فدا راجوروی، عبد السلام بہار، ڈاکٹر صابر مرزا، رشید قمر، خورشید بسمل، اقبال نازش، عبدالرشید رینہ، فاروق مضطر، شبیر راتھر، سجاد پونچھی، لیاقت جعفری، نذیر حسین قریشی، آنند لہر، پرتپال سنگھ بیتاب اور روبینہ میر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی خطے میں تحریک بقائے اردو نامی ایک فعال ادبی تنظیم بھی اردو زبان کو اپنے کھوئے ہوئے حقوق واپس دلانے کی جدو جہد کر رہی ہے۔ ان سبھی مقتدر قلم کاروں کے ریشحاتِ قلم معیاری اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں کی اس کہکشاں میں روبینہ میر بھی ایک تابناک اور درخشاں ستارے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری کے موضوعات اور مضامین میں مختلف رنگ سمائے ہوئے ہیں۔ نا موافق ادبی ماحول میسر ہونے کے باوجود روبینہ جواں سالی میں اتنی نیک نامی حاصل کرسکی ہیں۔ جس پر کئی کہنہ مشق سخنور بھی رشک کرتے ہیں مگر اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ روبینہ جی نے اپنی اعلیٰ منزل

حاصل کر لی ہے بلکہ انہیں مزید محنت کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر وہ اسی رفتار سے قلم چلاتی رہیں اور شعر برائے شعر کہنے سے پرہیز کرتی گئیں تو انشاءاللہ آئندہ چند ہی برسوں میں وہ ریاست کے اردو شعرا کی صف اولیں میں جگہ پانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ مجھے ان کے یہ شعر بہت پسند ہیں۔

زندگی اپنی رہی بند کتابوں کی طرح پڑھ نہ سکا ہم کو کوئی زمانے میں
چہرہ پڑھنے میں ہم بھی تھے ماہر مگر دور اتنا تھا ہم سے دکھا کچھ بھی نہیں
دشت وصحرا کی طرح لگتے ہیں اب یہ گلستاں جب سے خالی ہو گئے گلدان تیرے شہر میں

روبینہ میر کی شاعری میں حق وصداقت کے احساسات کا سب سے زیادہ غلبہ ہے۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے ان کی شاعری نسوانی جذبات کی عکاسی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس قسم کے موضوعات دیگر موضوعات کے مقابلے میں کم ہیں۔ انہوں نے شاعری کے توسل سے عالمِ انسانیت میں رونما ہونے والے مدو جزر کی تصویر کشی اور محبت وخلوص کی فضاء قائم کرنے کے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں کہیں کہیں متکلم مرد نہیں بلکہ ایک نازک مزاج خاتون ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ایک خاتون ہونے کے سبب روبینہ میر صنف نازک کے ساتھ ہونے والی طرح طرح کی زیادتیوں کو جس طرح بیان کر سکتی ہیں، وہ بڑے سے بڑا مرد شاعر بھی بیان نہیں کر سکتا۔ مثلاً طلاق شدہ خاتون کے جذبات جس انداز سے انہوں نے ظاہر کئے ہیں وہ کوئی مرد شاعر بہ آسانی نہیں کر سکتا۔ مثلاً یہ اشعار:

طوفان نے جوڑا لا تیرے گھر پہ اثر لکھ دے ہوتے ہیں بسر کیسے اب شام وسحر لکھ دے
تشہیر اگر تجھ کو پانی ہے تو روبینہ ظلمات کی ہر شب کو پرتاب سحر لکھ دے

روبینہ کو جہاں پونچھ اور راجوری سے خونی رشتہ ہونے پر فخر ہے، وہیں اس کا دل وہاں کے بھائی چارے کی تقسیم پر مضطرب ہے۔ وہ اپنے دلی جذبات کو فنکارانہ انداز میں اظہار کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

پونچھ میری جنم بھومی اور مرا اسسرال ہے ارض راجوری مرا ماضی بھی ہے اور حال ہے
جسم راجوری مرا اور پونچھ میری جان ہے جسم وجاں کے واسطے ہر شئے مری قربان ہے

روبینہ میر کی عقیدتی شاعری کا بھی ایک الگ تاثر ہے۔ یہ شاعری اس ماحول، عقیدے اور زندگی کی ہے جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ ان کا گھرانا سماج میں عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے اور خود روبینہ وراثت میں ملیں چند اعلیٰ اقدار کی پاسدار ہیں۔ خدا کے فضل وکرم

سے ان کا عقیدہ سچا اور صاف ہے۔اس ضمن میں ان کے لکھے ہوئے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

وہی رب ہے وہی اللہ جس کا بول بالا ہے
شروع کرتی ہوں اس کے نام سے جو رحم والا ہے
وہی تو سب کا خالق ہے، وہی تو سب کا مالک ہے
جو ہے ہر بات پر قادر، جو روزی دینے والا ہے

انہیں بھی دیگر مسلمانوں کی طرح حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے روضہ ءاطہر کی زیارت کا شوق ہے۔ وہ بھی عشق رسول ﷺ میں غلطاں ہیں۔ بڑے ادب کے ساتھ مدح رسول ﷺ کرتے ہوئے فرماتی ہیں:

جاؤں قربان میں آپ کی ذات پر　　　جو مجھے دے کے ہر جانکاری گئے
ان کے اوصاف کیسے کروں میں بیاں　　　جو مجھے دے کے اب انکساری گئے

روبینہ میر بنی نوع انسان کی بہبودگی اور خوشحالی کے لئے کچھ کرنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ان کا دل ہر مفلس اور لاچار کو دیکھ کر افسردگی کا شکار ہوتا ہے۔وہ اپنی دلی تمناؤں کو بھی لفظی جامہ پہناتے ہوئے لکھتی ہیں:

جس سے مجھ کو کئی امیدیں ہیں　　　اس چمن میں بہار دے یارب

روبینہ میر جی کی غزلیات میں روایت اور جدت کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کی غزلیں ان سارے لوازمات کا خیال رکھتی ہیں جو جدید اردو غزل کے لئے ضروری ہیں۔وسیع مطالعہ، زبان و بیان پر گرفت، الفاظ کی چست بندش،غنایت وغیرہ سب کچھ قابل توجہ ہیں۔مضامین کے اعتبار سے روبینہ کی غزلیں کسی ہشت پہلو نگینہ سے کم نہیں ہیں۔وہ خود اردو پڑھاتی ہیں۔اردو قلم کاروں پر ان کی نظر ہے۔شاعروں کے ایک بڑے ہجوم میں ان کی غزل سرائی کا ایک اپنا تاثر ہے۔وہ غزل گوئی کے فن میں رفتہ رفتہ اپنے جوہر دکھا رہی ہیں۔ چنانچہ" آئینہ ءخیال" میں غزل کا ایک اچھا خاصا حصہ موجود ہے۔ان کے چند منتخبہ اشعار درج ذیل ہیں:

میں اس انجمن کو سجانے چلی ہوں　　　نئی ایک دنیا بسانے چلی ہوں
کسے حال اپنا سنانے چلی ہوں　　　میں کیوں ہاتھ اس سے ملانے چلی ہوں
انسانیت سی چیز زمانے میں اب نہیں　　　روبینہ یہ زمانہ بھی کتنا عجیب ہے
یہ کیسی آزادی آئی جہاں سوچنے پر ہے پہرا　　　اس کی باتوں سے لگتا ہے وہ ہے دل کا کتنا گہرا

روبینہ میر پابنداور آزاددونوں قسم کی نظمیں کہتی ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے اردو کے سر برآوردہ نظم گوشعرا کی نظموں کا عمیق مطالعہ کیا ہے اوران سے روشنی حاصل کی ہے۔ان کی نظموں کے عنوانات پر ہی گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظموں میں کس قسم کے موضوعات کو باندھا گیا ہے۔مثلاً نظم" وطن کی بیٹیوں کے نام،نئی نسل کے نام،وادیء کشمیر،عورت،میرا ساتھی میرا قلم، اردو زبان، انسان ،چاند،سیاست، ماں، جینے کی آس،ٹائم پاس، قفس میں قید چڑیا وغیرہ ایسے عنوانات ہیں جس پر اچھی بحث وتمحیص ہوسکتی ہے۔ان نظموں میں روبینہ کے قلم کی روانی اور خیالات کی رنگینی دور سے ہی قاری کو اپنی جانب کھینچنے لگتی ہے۔وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں،وہ بخوبی کہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔یہی ان کے فن کے کمال کا ایک روشن پہلو بھی ہے۔آج کل نظم گوئی کافی زور پکڑتی جارہی ہے اور اپنی الگ پہچان قائم کرنے میں بہت معاون ہے۔روبینہ میر کی چند نظموں کے کچھ بند خدمت میں حاضر ہیں۔

اۓ میرے وطن کی بیٹیوں
نہ کسی پہ ہرگز یقیں کرو
کبھی گاڑ دیتے تھے ریت میں
اب مار دیتے ہیں پیٹ میں
کوئی مار کے ڈال دے گیٹ میں
کوئی پھینک دے تمہیں کھیت میں

(نظم" وطن کی بیٹیوں کے نام")

کیا ہندو کیا مسلم اور سکھ وعیسائی
چمن کے ہیں سب پھول آپس میں بھائی
تم ہو کل کے گاندھی،ابوالکلام آزاد
تم ہو کل کے نہرو،بھگت سنگھ،آزاد

(نظم" نئی نسل کے نام)

لمحات پہ سیاست،حالات پہ سیاست
دنیا میں ہو رہی ہے ہر بات پہ سیاست
کیا ہوگا اس کا حاصل،کہنا ہے قدر مشکل

ہر کوئی کر رہا ہے ہر بات پر سیاست (نظم" سیاست")

اب جبکہ نثری نظموں کا ایک بڑا سلسلہ بھی چل پڑا ہے، اس لئے روبینہ جی بھی نثری نظمیں کہنے میں دلچسپی لے رہی ہیں۔ چنانچہ ان کے شعری مجموعے میں بھی چند ایسی نظموں کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ نظمیں بھی اچھی ہیں جو شاعرہ کی جدت پسندی کی آئینہ دار ہیں۔

لوگ روبینہ میر کی شاعری کو بڑی سنجیدگی سے پڑھ رہے ہیں جن کا ثبوت آئے دن شائع ہونے والے تذکروں اور تبصروں میں ملتا ہے۔ موجودہ دور کے سرکردہ قلمکاروں نے بھی انہیں ایک اچھی شاعرہ تسلیم کیا ہے جو ایک باعث فخر بات ہے۔" آئینہ ءخیال" کے ابتدائی صفحات میں استادسخن عرش صہبائی، راجوری کے سر برآوردہ قلمکار عبدالسلام بہار اور پونچھ کے تیز نظر تبصرہ نگار نذیر قریشی کے علاوہ امیر حسن شمسی، محمود الحسن محمود، امتیاز وانی اور جاوید انور کی تحریرات پڑھنے کو ملتی ہیں جن میں روبینہ جی کی شاعری کے خدو خال بطریق احسن ابھارے گئے ہیں۔ وادیء کشمیر کے جانے مانے ناقد ڈاکٹر نذیر آزاد اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

" روبینہ میر ریاست جموں وکشمیر کی ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے محض نسوانی خیالات کے اظہار پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ زندگی اور سماج کے تقریباً تمام گوشوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں جموں وکشمیر کا درد و کرب مختلف صورتوں میں نمایاں ہے اور مختلف علامتوں اور استعاروں کے توسط سے پوری دنیا میں جہاں ظلم اور استحصال کا بازار گرم ہے، وہاں کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ انہوں نے" دل سے نکلے دل تک پہنچے" والی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے عام اور سلیس الفاظ جو اپنی بہترین معنویت رکھتے ہیں، پر پورا اعتماد کیا ہے۔"

اچھا آغاز آدھی کامیابی والی بات اگر آزموہ اور سچی ہے تو روبینہ میر پورے اعتماد کے ساتھ اردو شاعری کے میدان میں سرگرم عمل ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب ان کے کلام کا شہرہ پورے برصغیر میں اپنا جھنڈا لہرائے گا۔

☆☆☆

Rubina Mir ki Adabi Royedgi by Masood Hassaas(Kuwait)

مسعود حسّاس (کویت)

روبینہ میر میں ادبی روئیدگی

یقیناً جامِ جم گول مٹول ضرور رہا ہو گا مگر ہمارے زمانے میں یہ مربع شکل میں واقع ہوا ہے۔ جی ہاں شوشل میڈیا کے بطن سے پیدا شدہ تمام تر مواد کو نگاہوں کے دامن پر جوش ءبڑے شرح و بسط کے ساتھ عیاں کرتا ہے اُسے ہم موبایل کہتے ہیں۔ اسی چوکور آنکھ کے حامل اسٹومینٹ کا وجود سینکڑوں نہیں بلکہ لاکھوں ادبی و غیر ادبی گروپ کے تخلیق کا سبب بنا۔ جو آگے بڑھ کر اشخاص کے باہمی تعارف کا بہترین وسیلہ کہلایا اسی چوکور وسیلے نے ایک بار مجھے ایسی شخصیت کی جانب متوجہ کیا جو جوابی شُکریے اور جوابی تبصرے کے ساتھ اس کے اغراض و مقاصِد کے علاوہ محاسن و مصایب پر بھی تفصیلی روشنی ڈالا کرتی تھی۔ ابتدائی مرحلے میں اوروں کی طرح مجھے بھی یہ تفصیلی جوابی ترسیلات قدرے شاق گزرے مگر اس کی افادیت کے پیشِ نظر دل نے بہر حال و بہر طور اسے قبول کیا اس لئے اس کے جوابات کا قدرے تفصیلی جواب رقم کرنے لگا۔

کُچھ ہی دن گزرے تھے کہ اُس نے کہا سر میں جموں کشمیر سے روبینہ میر آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ نے میری غزل پر جو تنقیدی تبصرہ کیا اُس پر تہہِ دل سے شُکریہ ادا کرتے ہوے بتانا چاہتی ہوں کہ غزل کے حاشیہ و بین السطور کی بناء پر کُچھ باتیں آپ نے ایسی کہی ہیں جس کا فوری جواب نہ دے سکی۔ جس کے لئے ہزار ہا بار معزرت خواہ ہوں ازاں بعد اُنہوں نے جو کُچھ بیان کیا اس سے اُن کی شائستگی۔ صاف گوئی۔ صاف دِلی کے علاوہ حفظِ مراتب پر عمل پیرا ہونے کی طلب واضح ہوی۔ سچائی یہ ہے کہ ان کے مراسلے کا حرف حرف اعلان کر رہا تھا کہ خلوص کیش. خلوص کار. خلوص بیز خلوص بردار. خلوص بدست. خلوص بکف ان جیسے تمام لغاتی مرکب الفاظ فی زمانا سطور و بین السطور سے نکل کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں اور اخیر امنہ چھپا کے اپنی جگہ پاؤں پسار کے بیٹھ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے مردم گزیدہ ماحول نے خواتین میں عدم تحفظ اور رائی کا پہاڑ بن جانے اور بنا دینے جیسے عوامل کے سبب اُنہیں حصار بدست کے ساتھ خود غرض. حریص. کام نکال کے پھینک دینے والا بنا دیا ہے۔ اس مردم دریدہ ماحول نے اپنے مسموم ناخن صنف نازک کے ادبی جسمانی ساخت سے ایسے پیوست کیے کہ وہ چاہ کر بھی غزل سے چاہت کا رشتہ نہ نبھا سکیں تو شاعر کس زمرے میں آئے گا۔ دوسری جانب بازار میں خام مال کی سپلائی اور قبل از وقت شہرت کے جِنّ کو مقید کرنے کی

للک اور چاہ کچھ ایسے اعمال کے صدور کا سبب بھی بنے جواز اں بعد چہ میگوئیوں کو ہوا دینے میں کلیدی کردار ادا کرتے رہے۔اس فضا میں اپنائیت الفت محبت احترام. آدمیت و انسانیت کی طرفداری خلوص کاری اخلاص برداری اور مثبت رویّے کی پاسداری کے ساتھ حفظ مراتب جیسے تہذیبی اثاثے کو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ روبینہ میر میں زندہ پاتا ہوں۔روبینہ میر سے چند روزہ تعارف نے میرے دل میں ان کیلیے وہ مقام طے کر دیا ہے جو برسہا برس سے میرے حلقے میں موجود بیشتر چہروں کے حق میں نہ آسکا، اسی لیے دل چاہتا ہے کہ بلاکم وکاست کہہ دوں کہ روبینہ میر کی ادب دوستی ادب پسندی میں تہذیبی رویّے کی واضح لہر انہیں دوسروں سے ممتاز کر چکی ہے۔عبارت کی قرآت سے یہ احساس بھی فزوں تر ہوا کہ اُنہوں نے اپنے مافی الضمیر کی ادائگی کے لئے زُبان و بیان۔جُملہ سازی۔اور دلیل و بُرہان سے پُر محاورات واستعارات کا استعمال کیا وہ روبینہ میر میں ایک اچھی شاعرہ سے کہیں زیادہ اچھی نثر نگار کا پتہ دے رہا تھا۔اُن کی نثر کے زیرِ اثر میں نے کُچھ غزلوں کے ارسال کی فرمایش کی جس کے نتیجے میں سامنے آیا کہ روبینہ میر میں وہ حسّاس نرم ونازک آدمیت پسند دل دھڑکتا ہے جو ہمہ وقت بنی نوع انسان کے لئے دستِ بدعا رہتا ہے اور کہتا ہے۔

میں سب کے لئے یہ دعا مانگتی ہوں میّسر ہو سب کو سکوں زندگی کا

یہ دعاؤں کی شہزادی ہمہ وقت تعمیرِ انسانیت کے لئے خود کو وقف کرتے ہوے اشعار کے چاک لے کر بیٹھی جس سے ہر شعر میں آدمیت کی بقاءاور نسلِ آدم کی صُلح جوئی کی جانب ترغیب اور معاشرے میں امن وآشتی کے غلغلے کی بات سامنے آئی۔سچائی یہی ہے کہ جب ھدف ہی شعر گری سے بہت آگے انسانیت کا فروغ ہو تو جُملے کیا جملہ سازی کیا بیانیہ کیا بیانیہ کی تکنیک کیا کیونکہ ھدف کے حصول کے لئے اہم ترین شے معاشرے کی تمام ترا ِکایاں اور اُن کی عقلی بالیدگی چیخ چیخ کے کہتی ہے کہ انہیں زبان و بیان کے قواعد وضوابط کے جھمیلے نہیں بلکہ بولی کی مِٹھاس اور ترسیل کی بے ساختگی کی اشد ضرورت ہے شاید اِسی لئے روبینہ میر نے اپنے اشعار میں پائے جانے والے کُھر درے پن کی صیقل گری پہ بہت زیادہ دھیان نہ دیتے ہوے اُن تمام موضوعات پہ قلم چلانے کی کوشش کی ہے جس سے آج انسانیت جوجھ رہی ہے۔

میری نگاہ میں شاعرہ کا یہ چناؤ ہی اُسے دوسروں سے ممّیز اور برتر بنانے کے لئے کافی ہے۔خُدا اُن کی انسان نوازی اور انسانیت کے فروغ کے لئے چلای جانے والی شعری تحریک کو دوام عطا کرے۔☆☆☆

Rubina Mir : Lamha-e-Maujood ki Sheri Nama Nigaar by

Naim Javed (Saudi Arabia)

نعیم جاوید (سعودی عرب)

روبینہ میر: لمحہء موجود کی شعری نامہ نگار

حرف و معنی شناس دوستو! استقبال کرو ایک اور اُردو شاعرہ کا جو "فردوسِ نظر کشمیر" سے اپنے خیالوں کی چاندنی اور تجربات کی قندیل سے نور بانٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ساتھ ساتھ عصری موضوعات کو مشکبار کرتے ہوئے ہمارے ضمیر و ذہن کو روشن کر رہی ہیں۔ ان کے ادبی نگارخانے میں عصر شناسی کی رنگارنگی کے ساتھ خود شناسی کی رعنائیاں بھی ہیں۔ سادگی کے سبب اسلوب سے خوشبو برستی ہے۔ ان کے اشعار کو صداقت سے تابِ سخن ملتا ہے۔ ان کی شاعری نے آس پاس کی دنیا سے ردِ عمل کی نفسیات سے بلند ہو کر اپنے ایمانی تجربات سے ادب کشید کیا اور اپنی تخلیقات میں ربّانی آرزوؤں اور تمناؤں کو شامل کیا ہے۔ لیکن جب جب ان کا وفا اندیش دل، درد سے کراہ اٹھتا ہے تو یہ اپنے آزار کو بھی اعزاز بنا دیتی ہیں۔ احتجاج کی لے بھونڈی چیخ و نعرہ نہیں بننے دیتیں بلکہ حریف کے ذہن و ضمیر کے بند کواڑوں پر دستک دیتی ہیں۔ جس کے سبب ان کی نظموں کے پڑھنے سننے والے کا تارِ نظر نہیں ٹوٹتا۔

ان دنوں جب کہ ادب میں جانے کیوں اہم سماجی موضوعات پر سناٹے راج کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چپ رہنا ہی تجریدی آرٹ گردانا گیا ہے۔ کیا دردمندی سے جڑے منظروں سے منہ پھیر لینے سے فکر و فن کو اعتبار ملتا ہے۔ اس لیے روبینہ میر نے غزل کی نغمگی کے ساتھ ساتھ جسارت و غیرت کا مظاہرہ بھی کیا ہے، جہاں زمانہ ہماری تاریخ اور تہذیبی یادداشتیں مٹانے پر اُتاولا ہے وہاں ایک تاکیدی اظہار سے جڑے شعری نقوش ثبت کر دئے ہیں۔ ان کے شعری کینواس کو جنت نظیر کشمیر کے جامِ جم میں دیکھا تو جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اکہری تعبیر ہوگی۔ ان کا شعری اُفق عالمی سچائیوں، ادبی اقدار اور غزل کے روپ رنگ سے جڑ کے چلتا ہے، جیسے۔۔

پُرانا زخم سِلنا چاہتی ہوں　　　میں اب خود سے ہی ملنا چاہتی ہوں

ہوائے عشق، چُھو میرے بدن کو　　میں بھی پھولوں سا کھلنا چاہتی ہوں

حسن شناسی تو شاعری کی مادری زبان ہے۔حسن کو منظر، محبوب یا معیار نظر میں جہاں ممکن ہو تلاش کرنا چاہئے۔ایک نظم کے چند شعر دیکھیں۔

کبھی تم دیر مت کرنا

میں روٹھوں تو منانے میں　　مجھے واپس بلانے میں
چراغ دل جلانے میں　　اندھیروں کو مٹانے میں
دیار دل سجانے میں　　کہ میرے پاس آنے میں
کبھی تم دیر مت کرنا

ان کی شاعری وفائے فن کے ساتھ ساتھ لمحہ ءموجود کی نامہ نگاری ہے۔ہر تازہ کار ذہن کی طرح بے جا پابندیوں چاہے وہ رسم ورواج کی ہوں یا سیاسی، اس سے جڑی الجھن اور گھٹن کا اظہار کرتی ہیں۔ساتھ ساتھ جیسے ہر اچھے ادب کا مذہب سے پر اسرار ذہنی رشتہ رہتا ہے اور ملک سے ایک تخلیقی تعلق بھی۔اس کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔

میں قید ہو کے رہ گئی رسم ورواج میں　　ڈالی جو اس نے پاؤں میں زنجیر کیا لکھوں
اک پل بھی زندگی میں مُیسّر نہیں سکوں　　میں اس کو اپنی شوم ءتقدیر کیا لکھوں

روبینہ میر کے شعری متاع میں پابند غزلیں بھی ہیں اور ازاد نظمیں بھی۔نظموں کا ایک اپنا خاص رنگ ہے۔آپ عنوانات کے دھنک سے ان کے شعری روپ رنگ، مہک ولمس کو محسوس کر سکتے ہیں''لوٹ آ''، جس میں گزرے منظر ومحبوب کو پانے کی ندا جیسے ان کے قریہ جاں سے ابھرتی ہے۔

''خوابستان''''سیاست''جس میں نسائی علامتوں سے''سیاست''کو ایک بے راہ رو حسینہ اور اس کے عشوہ وغمزہ سے دنیا کو گھائل بتایا ہے۔جس میں روبینہ میر کے حسن زبان اور سیاست کی سفاکی اپنے منفرد رنگ میں ہے۔''وہ آئے گا''میں ایک ماں کا اپنے بیٹے کے کسی نامعلوم تعذیب خانے میں گم ہونے پر اس کا عید کے دن راہ تکنا بڑا کربناک منظر پیش کرتا ہے۔لفظ لفظ سے انسو ٹپکاتی ہوئی یہ نظم تاثر کا سحر پھونکتی ہے۔''کڑوا سچ''میں ایک تنہا عورت کی زندگی۔راہ چلتے وحشی لوگوں کے حیاباختہ بے باکیوں کا بہترین محاکمہ ہے۔''آصفہ''ایک ننھی سی بچی جو ہوس کے درندوں کے ذریعہ چیر پھاڑ دی گئی۔اس میں اپنے کرب کو کھری امیجری جیسے 'آوارہ بیل' کی منہ زوریوں سے درندگی کو سفید کاغذ پر اتار دیا ہے۔''نیلام گھر''میں عدالتوں کے بکتے قوانین، انصاف گزار اور رشوت خوروں

کے چہروں سے نقاب نوچ کھرچ کر پھینکی ہے۔''بچہ مزدوری'' کا موضوع تو عالمی درد کا عنوان ہے۔ جہاں بچوں کا پھول سا بچپن کانٹوں میں گھسیٹا جاتا ہے۔خوب لکھا۔اب نیچے ایک سرسری انتخاب دیکھیں۔

جہاں ہر گام پر مشکل کھڑی تھی　　میں ان راہوں پہ تنہا چل پڑی تھی

....

آ ہی جائے گا آتے آتے ہی　　میرے دل کے قرار کا موسم
کس قدر دل کو زخم دیتا ہے؟　　گردشِ روزگار کا موسم

....

دیر و حرم ہوں یا ویرانہ　　ایک منزل ہے کتنے رستے

...

تیرے دل کو حاصل ہیں راحتیں میرے حصے میں غم کی رات ہے
وہ تیرے نصیب کی بات ہے یہ میرے نصیب کی بات ہے
ہیں جہاں میں سینکڑوں مسئلے جن سے رہتی ہوں بے نیاز میں
میرا اپنا ہی اک جہان ہے میری اپنی ہی کائنات ہے

....

نہ پیدا ہوگی دل کے گُلِستاں میں آرزو کوئی　　مجھے معلوم ہے تا عُمر ویرانی میں رہنا ہے

....

وہ سیاست داں ہیں ان کے واسطے　　دل شکن ہرگز نہ ہونا چاہئے

.....

نہیں مُجھ کو روبینہ کچھ چین حاصل　　میرے رب کی مُجھ پر مہربانیاں ہیں

....

آگ ہی آگ ہے، اور یہ اہلِ جُنوں　　کودتا ہے جو اس میں وہ نادان ہے

....

اُن کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ سے　　دِل کو قدرے قرار آیا ہے

....

''دستورِ دُنیا''

نگری نگری چھایا سُورج مجھ سے کیوں کترایا سُورج
لوگ یہ پوچھیں گے روبینہ تُم نے کہاں چُھپایا سُورج ؟

•••

''دِفاع''

بہت سوچا بہت سمجھا
بہت پرکھا بہت پوچھا

••••

روبینہ میر کی شاعری کسی بڑے دعوے کے بجائے زندگی کی سادہ سچائیوں کا صد رنگ گلدستہ ہے۔ حیات بخش موضوعات اور جان لیوا منظروں کا موزیک ہے۔ ان کے ہر شعر پر لاکھ صناعی سے سجی جھوٹی شاعری قربان کی جاسکتی ہے کیونکہ انھوں نے سچائیوں کو سمیٹ کر رکھا ہے۔ اور یہی درد ہے جس کی توسیع ممکن ہے۔ میں ان کو ان کے اس مجموعہ کلام پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

Khayaban-e-Kashmir ki Nauhagar : Rubina Mir by Dr. Mirza Shafaq Husain Shafaq (HOD Urdu Husainabad Govt. degree College Lucknow

ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق (صدر شعبہ اردو حُسین آباد گورنمنٹ کالج لکھنؤ)

خیابانِ کشمیر کی نوحہ گر: روبینہ میر

روبینہ میر کا تعلق اس ارضِ مقدس سے ہے جسے جنتِ ارضی کہا جاتا ہے۔فی زمانا اس جنتِ ارضی کو معاندین کی نظر لگ گئی ہے،ہم اس جنتِ ارضی کی بات کر رہے ہیں جہاں فی الوقت نیلم کے کنارے آئے دن خون کی ہولیاں کھیلی جاتی ہیں،جہاں کا سبزہ زار اب دل آزار بن چکا ہے،جہاں آئے دن بناتِ حوّا کی عصمت تار تار کی جاتی ہے،جہاں گلابوں کے پھولوں سے بھی بارود کی بُو آتی ہے،جنّتوں کی شہزادی ملکہ زرنگار یعنی روبینہ میر اسی خزاں رسیدہ خیابانِ کشمیر کی نوحہ گر ہیں،ان کی شاعری مظلوموں کی آہ وفغاں،یتیموں کے نالہ وشیون اور بیواؤں کی آہ وزاری سے عبارت ہے۔

یہ اس وقت شعر کہتی ہیں کہ جب کسی یتیم کی چشمِ خوں بستہ سے آنسو ٹپکتے ہیں۔جب کسی دُلہن کی مانگ میں افشاں کی جگہ لہو چھڑکا جاتا ہے۔جب کسی ماں کی گود کو اجاڑ دیا جاتا ہے۔جب کسی عورت کا سہاگ لوٹ لیا جاتا ہے،دراصل روبینہ میر کی شاعری کشمیر اور اہلِ کشمیر کے کربِ ناتمام کی حکایتِ خونچکاں ہے۔واضح رہے کہ روبینہ میر کی شاعری کا یہ محض ایک پہلو ہے۔اس کے علاوہ بھی اُن کی شاعری کے مُختلف رنگ ہیں۔

جب آسمان پر نجومِ لامعہ نمودار ہوتے ہیں اور ماہتابِ لیلۃ المقمر ہ کے ساتھ ضیا پاشیاں کرتا ہے،جب اُفقِ عالم تاب پر نیرِ اعظم طلوع ہوتا ہے،جب گلشن میں کلیاں چٹختی ہیں،جب غنچے پھولتے ہیں،جب گُل کھِلتے ہیں تب خوشبوئیں ان کے مشامِ فکر کو معطر کرتی ہیں اور پھر ان کے قلم سے خوبصورت اور بامعنی نظمیں منصۂ شہود پر آتی ہیں۔نیز جب زُلفیں مشکیں فضاؤں میں لہراتی ہیں،جب نرگسی آنکھیں سحر کاری کرتی ہیں،جب شبنمی لہجے روشنیاں بکھیرتے ہیں،جب یاقوتی لب صحیف عشق پر تبسم کی لکیریں کھینچتے ہیں،جب سازِ اُلفت پر نغمہ سرائی ہوتی ہے،جب مضرابِ محبت کو چھیڑا جاتا

ہے،تب روبینہ میر کے غنائی الفاظ غزلوں میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

المختصر روبینہ میر کی شاعری مختلف رنگوں اور آہنگوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ماضی کی روایات، حال کی حکایات اور مستقبل کی بشارتیں ہیں،لہذا مجھے اُمید ہے کہ رنج وغم اور حُسن وعشق کے اس صحیفے کو اردو کا ہر قاری رحلِ قلب پر سجا کر رکھے گا۔کیونکہ اس مجموعے کی خالق روبینہ میر کو نہ صرف بابِ سخن پر دَستک دینے کا ہُنر آتا ہے بلکہ بَصارت اور سماعت کے نہاں خانوں میں اترنے کا فن بھی آتا ہے۔

☆☆☆

Rubina Mir Ka Sheri"Yaqeen-o-Awhaam" ka Safar by Dr. Gulzar Ahmad Wani cell- 7006057853

ڈاکٹر گلزار احمد وانی

روبینہ میر کا شعری ''یقین واوہام'' کا سفر

روبینہ میر کئی دہایوں سے تخلیق کی وادیوں سے گزر رہی ہے وہ جموں وکشمیر کی ان نمایندہ شعری آوازوں میں ایک منفرد آواز ہے جنہوں نے پروین شاکر کی طرح ادبی حلقوں میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ وہ ایک غزل گو کی حیثیت سے کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اور تمام ادبی حلقوں سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ راقم کے پاس ان کا ایک شعری گلدستہ بنام ''اضطراب'' موجود ہے جس میں نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی وافر تعداد میں موجود ہیں۔

جہاں تک ان کے موضوعات کا تعلق ہے، انہیں اپنی بات کہنے میں لفظیاتی اعتبار سے کہیں کوئی دقت پیش نہیں رہی ہے۔ اور یوں وہ ہر ایک موضوع پر اپنا اندرون باہر نکالنے میں نہ صرف بضد ہیں بلکہ کامیاب بھی۔ روبینہ میر کی شاعری میں جس خاص موضوع کی طرف راقم کا دھیان گیا ہے وہ یہ کہ ان کی شاعری میں جہاں امید وبیم ہے وہاں اوہام کے دوش بہ دوش یقین کا ایک لامتناہی سلسلہ بھی پایا جاتا ہے۔ بقول پروفیسر وہاب اشرفی:

''پوئٹکس (poetics) یا شعریات کی تفہیم میں بہت سے مرحلے ہوتے ہیں پھر بھی کسی شاعر کے اختصاص کو نشان زد کرنے کے لیے اس کی پوائٹکس (poetics) کی تلاش کرنی ضروری ہے۔ ویسے یہ لفظ بذات خود معنوی اعتبار سے کافی وسیع ہو گیا ہے لیکن اس کا بنیادی رشتہ تخلیق کا مرحلہ ہے۔ یعنی یہ کہ شعر کی تشکیل کے سلسلے میں خلاقیت کا کس حد تک ثبوت فراہم ہو رہا ہے''

(نئی سمت کی آواز پروفیسر وہاب اشرفی ص نمبر 84 ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ اشاعت 2010)

روبینہ میر اپنی شاعری میں جن لفظیات کا برمحل استعمال کرتی ہیں۔ ان سے ان چیزوں کا پتہ لگانا اب آسان سا ہو گیا ہے کہ ان کے جذبات جو کہ سیل رواں کی مانند بہہ رہے ہیں، کا ماخذ کیا ہے؟ اور وہ سوتے جہاں سے انہیں اپنے احساسات کو اظہار کی راہ مل جاتی ہے۔ وہ کیا ہیں؟ ان کی

لفظیات میں جو قوت اور حرکت ہے وہی انہیں اس سیل رواں کو بہہ جانے کا ایک نیا راستہ چھوڑ جاتے ہیں۔ موصوفہ کا اسلوب بھی دلکش اور شیریں ہے۔ اور انہیں اپنی بات کہنے میں اور قاری کے سامنے رکھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسے اشعار وافر تعداد ان کے یہاں پائے جاتے ہیں جن میں یقین کے ساتھ ساتھ اوہام کا سفر لازم وملزوم کی طرح عیاں و بیاں ہوا ہے۔

دیر و حرم ہو یا ویرانہ — ایک منزل ہے کتنے رستے

--

سرحد و ہم وگماں سے گزرے — کیا کہیں ہم بھی کہاں سے گزرے

--

یہ جہاں یاد کرے گا برسوں — ہم بھی کچھ ایسے جہاں سے گزرے

--

دل شکستہ نہیں ہو پائے ہم — بارہا آہ و فغاں سے گزرے

--

کوئی نہ تھا ساتھ اپنے روبینہؔ — جب بھی ہم ان کے وہاں سے گزرے

--

خزاں کی تھی جب دسترس ہر کلی پر — چمن میں بہاروں کا کھٹکا نہیں تھا

--

تیز ہیں غم کے الاؤ چپ رہو — اور ابھر آئیں نہ گھاؤ چپ رہو

--

مندرجہ بالا اشعار میں یقین واوہام کا ایسا سنگم مل رہا ہے کہ یہ بات طے پانا بہت کٹھن ہے کہ ان کے یقین کا غلبہ اوپر یا حاوی ہے یا پھر اوہام کا۔ بہرحال کچھ بھی ہو یہ ایک ایسے شعری تخلیق کار کے اس سفر کے بارے میں عندیہ دے رہے ہیں کہ جس کے یہاں ان دونوں چیزوں کا ہونا زیست کی رونق کو دوبالا کرتا ہے۔ اور اس کی جڑوں اور پتوں کو مزید توانائی بخشتے ہیں۔ جب بھی کوئی غم کا الاؤ پھنک رہا ہوتا ہے تو اس کی آڑ میں زندگی اس رنگ میں اور رنگ جاتی ہے کہ جس کی صبحیں اور شامیں بہت ہی معنیٰ رکھتی ہیں۔

روبینہ میر جہاں اپنے اوہام کی حدوں سے گزرتی ہے وہاں ایک نیا جادہ کانٹوں کی

جھاڑیوں میں سے نکال کے لاتی ہے۔ اور زیست کی رنگینیاں اور بھی رنگدار اور پنکھدار بن جاتی ہیں۔

ان کے یہاں امید کے ساتھ بیم بھی موجود ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ایک پھول کے ساتھ ساتھ کانٹوں کی سنگت ہوتی ہے۔ یہاں شعری کردار کبھی بھی ان چیزوں سے نہیں گھبراتی ہے اور نہ ہی خوف زدہ ہوتی ہے۔ وہ ایسے موسم بہار کی مانند ان چیزوں کو دیکھتی ہے۔ کہ جہاں بادلوں کے گرجن سے برسات کا نا یقینی ہو جاتا ہے تب جا کر زمیں سے نئی امیدوں کی فصل بھی اگ آتی ہے۔
یعنی اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تب تک انہیں کسی بھی طمانیت اور خوشی کا معنیٰ سمجھ سے بالاتر دکھائی دیتا ہے جب تک صعوبتوں کے بادل نہ گرجیں اور تب جا کر وہ خوشی اور وہ طمانیت مزید مسرت سامانیاں بہم کر سکتی ہیں۔ روبینہ میر کبھی بھی شکستگی میں یقین نہیں رکھتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہر نئی سحر کی پو ظلمتوں سے ہی پھوٹتی ہے اور ہر بلا کے بعد مسرت سامانیاں میسر آتی ہیں۔ اور ایسے میں وہ اپنے ماضی کی یادوں کو اور مضروبیت سے بچاتی ہے۔ بلکہ یقیں کے مضراب سے دوام بخشتی ہیں۔ وہ اپنے من کی جانب ہمیشہ سے ہی گامزن دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں سے انہیں اک طمانیت اور سکون مل جاتا ہے۔

مدتوں تک غیر کے بن کے رہے　　　اب تو ہم کو اپنا ہونا چاہئے

--

نفرتیں کتنی بھلے درپیش ہوں　　　بیج الفت کا ہی بونا چاہئے

--

دور ہوگی اور نظروں سے سحر　　　ہے بکھرنے کو شب ظلمات اور

--

غم کے جو بادل ہیں چھٹنے کے نہیں　　　کھل کے برسے گی ابھی برسات اور

مندرجہ بالا اشعار کے ساتھ کئی دوسرے اشعار کی شکل میں بھی یہی اندر کی آوازیں آرہی ہیں کہ ان کے یہاں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے من پہ بوجھ برداشت کر کے بھی کسی سے محو ہنگامہ آرائی پہ نہیں اتری ہیں۔ اور ہر جگہ اک نئی ضبط کا احساس جگا گئی ہیں۔ انہیں انسان سب سے پیارا ہے اور انسانیت کی شرمساری سے بیزاری ہے۔ اور اس عمل میں وہ پیش پیش ہیں کہ انسان انسانیت سے زندہ ہے اور جبھی یہ گن اس سے رفع ہو جائے تو شرمندگی دامن گیر رہتی ہے۔ یہ

احساس نہ صرف ان کی غزلیات میں جھلکتے ہیں بلکہ ان کی نظموں کو بھی تانا بانا فراہم کرتے ہیں۔اس طرح کے احساسات ان کی بیشتر نظموں میں بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں:

کتنا اذیت پسند تھا
وہ شخص
جو میرا اعتماد توڑ کر
میرے یقین کو۔۔۔۔حیرت میں
حیرت کو۔۔۔۔
خوف و دہشت میں بدل کر
منا رہا تھا جشن (ایک احساس)

اور یہ تراشہ
۔۔۔۔تم زبان بن جاؤ
تم ہمارا احساس بن جاؤ
تم ہم میں سما کر۔۔۔۔۔۔
ہمارا درد محسوس کرو (کڑوا سچ)

اس طرح بہت ساری نظموں میں ایسے جذبات کا بہاؤ نظر آتا ہے۔اگر چہ زمانے کے تمام ظلم وستم ہنس ہنس کر دور جدید کا انسان اپنے اندر برداشت کر رہا ہے، پر ایسے حالات میں پھر بھی انہیں سہاروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ورنہ اس جدید دور میں انسان کا دم گھٹ سکتا ہے۔ایک طرف ان کے شعری کردار میں ہمت اور قوت موجود ہے اور وہیں دوسری جانب باقی لوگوں میں بھی ہمت اور قوت جگا رہا ہے۔اور یہ روبینہ میر کی شاعری کا ایک مضبوط وصف ہے جو کہ اوروں میں بہت کم دیکھنے کو مل جاتا ہے۔روبینہ میر کو رشتوں کی بحالی کا الم اور غم ہے۔جیسا کہ دور جدید میں رشتوں کی سرد مہری دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں سے ان کے اس احساس کی بو بخوبی محسوس ہو رہی ہے۔اس دور نے انسان کو اپنوں سے جدا کروایا ہے۔خودکشیوں کے واقعات میں آئے دن بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ بھائی بھائی سے جدا ہے۔اس ضمن میں ان کی یہ نظم ''بھائی'' ملاحظہ ہو:

ایک ہی ماں کی کوکھ سے

جنم لینے کے باوجود
ایک ہی گھر میں ساتھ ساتھ
پلنے بڑھنے کے باوجود
ایک ہی آنگن میں کھیل کود کر
جوان ہونے کے باوجود

وہ۔۔۔
میرے لیے کس قدر اجنبی ہو گیا تھا
کہ میں اسے دیکھ کر
پہچان نہ پائی
کچھ دیر دماغ پر
سخت زور ڈالنے پر

یاد یا۔۔۔
کہ وہ میرا بھائی ہے (بھائی)

ایسے حالات میں بھی وہ کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑتی ہیں اور عالمی مسائل جن میں موسمیات میں بدلاؤ کے بھی باس مل جاتے ہیں۔۔ پر بھی ان کے نادر خیالات کی بھر مار ہے۔ مشینی دور میں جس طرح انسان اذیت ناکی میں اپنے صبح و شام گزار رہا ہے، اس سے تو ہر ایک کی آنکھ نم ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو مہنگائی کا زمانہ ہے اور دوسری جانب رشتوں کی بے مہری انسان کو گہری سوچ میں لے جاتی ہے۔ مگر روبینہ میر جس طرح سے اس دور میں بھی اطمینان محسوس کر رہی ہیں اس میں بھی یقیں کے سو پردے ہی دیکھے جا سکتے ہیں۔ امید یہی کی جا سکتی ہے کہ ان کی زمیں سے ایسی ہی فصل نکلنے سے ماحول ساز گار رہو تا کہ ہر ایک دہقان کبھی بھوکا نہ سوئے۔ اور اوہام کا سلسلہ بھی اپنی خاتمیت کا اعلان کرے تا کہ قاری کے یہاں یقین ہی یقین محسوس ہو سکے۔ روبینہ میر کے یہاں جو یقین کے لیے لفظیات استعمال ہوئے ہیں وہ امید، خوب، جادہ نو، نیک قربت، گمان، ناز، درستی، شجر، گوارا، راستہ، اور پھول وغیرہ اور جو اوہام کے زمرے میں الفاظ آتے ہیں ان کا تعلق بھی بلواسطہ یا بلاواسطہ طریقوں سے مذکورہ بالا الفاظ سے ایک ربط اور جوڑ ثابت کر رہے ہیں، وہ ہیں۔ گمان، فریب، شکستگی، ڈر، خوف، بے چارگی، وہم امتحاں، دوری، گزرگاہ، یخ بستگی، بے مہری، مکاری، جھوٹ، آہ و فغاں،

اور بے سراپن وغیرہ۔اور کہیں کہیں ان کے یہاں مذکورہ بالا الفاظ تراکیب کی صورت میں بھی ظہور پذیر ہوجاتے ہیں۔ان کے یہاں الفاظ کے استعمال میں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔اور پھر پھر کے کہیں نہ کہیں یقین واوہام کی گزرگاہ سے نکلتے ہیں۔تب جاکر کوئی بھی موضوع کہیں بھی اپنی تنگ دامنی کا ثبوت فراہم نہ کرتے ہوئے اپنے دوررس نتائج سے آگاہ بھی کرلیتا ہے۔جس کے لیے تخلیق کار کو اپنے اسلوب میں نادرہ کاری کا جذبہ دور سے ہی واقف کراتا ہے۔

روبینہ میر کے یہاں جذبات میں کم وزن دیکھنے کو مل جاتا ہے جب کہیں کوئی بھی موضوع اس طرح کا ہو تو متوازن سوچ اور اس کے لیے لفظیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے شواہد ان کے یہاں ضرور ملتے ہیں۔روبینہ میر کا شعری سفر جس رفتار سے آگے آگے اپنے منازل طے کر پا رہا ہے، اس سے تو یہی سفر آگے کی اور بڑے انہماک اور طمطراق سے بڑھ جانے کا قوی امکان ہے۔کیونکہ جس نہج سے ان کا قلم زمانے کی ستم ظریفیوں کو بیان کرنے کے لیے چل رہا ہے، وہاں سے بہت سارے معنوی امکانات برآمد ہو سکتے ہیں۔وہ حالات کی نبض شناس شاعرہ ہیں تبھی اپنا کوئی بھی تجربہ اور مشاہدہ بیان کے قابل ہے اور اعلیٰ ذہانت اور دیانت داری سے سماجی منظر اور پس منظر کی اتھاہ گہرایوں سے اپنے مطالعے میں لاکر ان کا شعری ازالہ بندی کی خواہش بے لاگ و بے داغ رکھتی ہے۔انہیں زمانے کی ستم ظریفی پر کبھی بھی افسوس نہیں ہے اور جانتی ہیں کہ زمانے کی اتھل پتھل کے کھیل میں کچھ بھی ممکن ہے۔پر انہیں حالات کے تغیر پر تفکریت کی ستائش کی خلش محسوس ہو رہی ہے۔یہاں میں ان کی ایک نظم پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں زمانے کے بدلے ہوئے چلن کا کہیں پر گلہ شکوہ کے بجائے قدروں کی شکست وریخت کو مدنظر رکھ کر جو اظہار صلابتی پیرایے میں بیان ہوا ہے وہ قابل مطالعہ ہے:

''قصہ جو تم نے پوچھا ہے''

ذرا ٹھہرو۔۔۔۔۔سنو جاناں
قصہ جو تم نے پوچھا ہے
شہر اب بھی ویسا ہے
بالکل پہلے جیسا ہے
وہ جب ہم ساتھ رہتے تھے
موسم۔۔۔۔۔تب بھی بدلتا تھا
موسم۔۔۔۔اب بھی بدلتا ہے

کبھی پت جھڑ-----کبھی ساون
خزاں کے بعد گل لالہ---
چڑیاں اب بھی چہکتی ہیں
کلیاں بھی مہکتی ہیں
جھرنے اب بھی کانوں میں
میٹھی بنسری بجاتے ہیں
کوئل گیت گاتی ہے
من اب بھی لبھاتی ہے
سمندر اب بھی ٹھاٹھیں مارتا ہے
لہریں بھی اچھلتی ہیں
چاند بھی چمکتا ہے-----
تارے رقص کرتے ہیں
بادل بھی برستے ہیں
مگر بادل برستے ہی
حالات کا----دریا
کیا کیا گل کھلاتا ہے
کبھی سرحد مٹاتا ہے
کبھی سرحد بناتا ہے
بہت کچھ بہا لے جاتا ہے
نئے رستے-----بناتا ہے
نئی بستی بساتا ہے
نیا کچھ کر دکھاتا ہے
بچھڑوں کو ملاتا ہے
شہر اب بھی ویسا ہے-----بالکل پہلے جیسا ہے
وہ جب ہم دونوں بستے تھے

ساتھ روتے ۔۔۔۔ ہنستے تھے
مگر حالات کا دریا
جب اس سمت آتا ہے
کچھ تبدیلی لاتا ہے
نیا کچھ کر دکھاتا ہے

یہاں ایک ارتقائی صورت حال کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد ایک قاری بنا داد دئے نہیں رہ سکتا ہے۔ اضطراب'' کا شعری گلدستہ اسم با مسمیٰ کی حیثیت رکھنے کے بعد ایک تخلیق کار کی تمام امیجری صفحہ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے جو کسی بھی تخلیق کار اور فن کار کی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے کافی ہے۔ اور یہ روبینہ میر کی سب سے بڑی فلاح و کامیابی ہے۔

☆☆☆

Rubina Mir ki Sheri Kainaat by Enginier Aslam Shahzaad

انجینئر اسلم شہزاد

روبینہ میر کی شعری کائنات

پچھلے دنوں جو کتب میرے زیر مطالعہ آئیں۔ان میں ایک شعری مجموعہ " آئینہ ءخیال" بھی شامل ہے۔ کتاب کافی دیدہ زیب ہے۔مجموعہ کا کچھ حصہ غزلیات پر مبنی ہے جبکہ ایک حصہ نظمیات کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔اوائل میں کتاب کے حوالے سے کچھ مختصر مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔ یہ سب ملا کر کتاب نے اچھی خاصی زخامت اختیار کی ہے۔

زیر نظر مجموعہ کلام چونکہ ایک شاعرہ کی ادبی نفسیات پر مبنی ہے۔اس لئے یہ بات اور بھی قابل تحسین ہے کہ ایک خاتون نے اپنی بکھری ہوئی شعری کاوشوں کو ایک مجموعے کی شکل دے کر منظر عام پر لائی ہیں۔ مجموعہ کلام کے پہلے حصے میں شامل مضامین شاعرہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں، جبکہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ کچھ غیر ضروری حوالہ جات سے کتاب کی مجموعی حیثیت پر خراب اثر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ایک مضمون نویس نے شاعرہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے شاعرہ کی ولادت کی منظر کشی کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے کسی پیمبر کی ولادت باسعادت ہونے والی تھی۔ اور موصوف کو کشف والہام ہو رہے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر غیر ضروری انشا پردازی بہت گراں گزری۔ جیسے کہ یہ جملہ" ایک ہلکی سی چیخ سے شاعرہ کا دنیا میں وارد ہونا اور وہ بھی دستک دے کر۔۔۔۔۔۔ یا پھر" کچھ گمنام آوازوں کے درمیاں۔۔۔۔" اس طرح کی عبارت ایک تحریر کو عامیانہ بنا دیتی ہے جن سے گریز کیا جانا چاہئے تھا۔

اسی طرح کتاب کے انتساب کے حوالے سے بھی کچھ چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ کتاب صرف ایک شخصیت کے نام سے منسوب کی جاتی۔ خاص کر شعر و شاعری کی کتابوں کو اللہ رب العزت سے منسوب کرنا جائز بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ شاعری میں بہت ساری لغو باتیں بھی جانے انجانے میں شامل ہو جاتی ہیں۔

مجموعہ کلام میں شامل غزلیات کا زیادہ تر حصہ لمبی بحر کی غزلیات پر منحصر ہے۔ لمبی بحر میں غزل لکھنا بذات خود ایک محنت شاکہ کا تقاضا کرتا ہے جس سے بہر حال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ شاعرہ نے اس

عنایت کو بخوبی سنوارا ہے جو قدرت کی طرف سے ان کو عطا ہوئی ہے۔

جو دل میں زخم ہیں سوچا ہے تم نے ان کے بارے میں
اگر ناسور بن جائیں تو کیسے تاب لاؤ گے
اس دھوپ کی شدت میں کہاں سایہ ملے گا
گرتے ہوئے میں سارے شجر دیکھ رہی ہوں

ساری غزلیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ بہت ساری جگہوں پر موضوعات کی تکرار ہوئی ہے جس سے بچا جانا چاہئے تھا۔ اگرچہ زیادہ تر اشعار میں روانی ہے جو غزل کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ شاعری میں ایک بات مصدقہ مانی جاتی ہے کہ اچھا شعر وہی ہوتا ہے جس کا ایک معنی مخفی رہے۔ اس سلسلے میں روبینہ میر نے بہت سارے اشعار کامیابی سے لکھے ہیں۔ روبینہ میر نے شائستہ اسلوب کو اپنایا ہے۔ وہ باتوں کو براہ راست کہنے سے گریز کرتی ہیں، لیکن اپنے قلم کو زبان عطا کرتی ہیں۔

اس زباں سے اسے کچھ نہ کہنا مگر لفظ تحریر میں رکھنا تلوار سا

میں سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر کی شاعری کا کینواس مشاہدے اور مطالعے سے وسعت اختیار کرتا ہے۔ مشاہدہ اگرچہ ہماری روزمرہ زندگی کا خاصہ ہوتا ہی ہے لیکن مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ استاد شعرائے کرام کا کلام پڑھا جائے۔ تاکہ تصور اور تخلیق کی دنیا مزید پھیلے۔ خود زندگی کے ہر پہلو میں اتنا تنوع ہے کہ اگر ایک شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات کو زندگی سے جوڑ کر دیکھے تو موضوعات سخن کا ایک لامتناہی سلسلہ وارد نظر آتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ کلام شاعرہ کی ایک خوبصورت کاوش ہے جس میں انہوں نے جہان سخن میں طبع آزمائی کی جسارت کی ہے۔ اگرچہ کتاب کی شروعات میں شامل مضامین میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ روبینہ میر اپنے شعری تجربوں کو برتنے کے دوران نسوانی جذبات سے دستبردار ہوگئی ہیں۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ دراصل نسوانیت کو اس کے وسیع تر مفہوم میں لیا جانا چاہئے۔ نسوانیت کے دائرے میں ایک بیٹی، ایک بہن، ایک بہو، ایک ماں اور ایک معشوقہ بھی آتی ہے۔ کچھ لوگ نسوانیت کو حقیقی جذبات کے در پردہ جنسی اظہار کے ساتھ بھی وابستہ کر لیتے ہیں۔ یہ ایک غلط رجحان ہے۔

دنیا کی تصنیف نسائیت یعنی خواتین کو فطرت نے خود ہی نسوانیت کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔ اگر

چہ کچھ جذبات خواتین کے ساتھ زیادہ منسوب کردئے جاتے ہیں۔ جیسے کہ رحم دلی، ہمدردی، دلجوئی، اشکباری، صبر و قناعت، شفقت وغیرہ میرے نزدیک نسوانیت کا ایک ایسا خوبصورت اور پاکیزہ تصور ہے جس کے معنی چیزوں کو، رشتوں کو سلیقہ شعار طریقے سے برتنے کا نام ہے۔

کتاب میں شامل نظم" چار گلوں کا گلدان" میں جذبہ ءنسوانیت کے حوالے سے بہترین منظر کشی کی گئی ہے۔اگرچہ اس فطرت کے بچے کم وبیش ہر گھر میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کی روزمرہ کی زندگی کی معصوم سرگرمیوں کو صفحہ ءقرطاس پر اتارنے کی ذمہ داری روبینہ میر نے نبھائی ہے۔ یقیناً یہ نظم لکھ کرانہوں نے نسوانیت کا حق ادا کیا ہے۔اب اگرفنی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے کہ شاعرہ نے اس نظم کی کچھ ہیت 5 مصرعوں، کچھ بند 6 مصرعوں اور کچھ بند 7 مصرعوں کے کیوں لکھے ہیں۔اگر بند میں ایک ہی تعداد میں مصرعے ہوتے تو نظم کے حسن میں اور بھی اضافہ ہوتا۔اگرچہ " آئینہ ءخیال" میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جنھوں نے مجھے متاثر کیا ہے لیکن ان سب کا تذکرہ کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔زندگی کی بے ثباتیوں اور محرومیوں کا خوشنما انداز میں تذکرہ کچھ اشعار کو بے پناہ حسن عطا کرتا دکھائی دیتا ہے۔

کیا کہیں جن کی آنکھوں میں نیندیں نہ تھیں ان کے خوابوں کو آخر بکھرنا ہی تھا
ساقی ءبزم مجھ پر ہو کچھ کرم میں بھی ہوں سختی ءغم کا مارا ہوا
کوئی بھی نہ مرہم یہاں کارگر ہے رہے یاد اتنا یہ زخم جگر ہے
ہیں ایسے میں ویرانیاں دل کو لازم شجر آرزوؤں کا جب بے ثمر ہے

اور کچھ اشعار روبینہ میر کو بحیثیت ایک شاعرہ کے تسلیم کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جن میں تخیل کی پختگی، اسلوب کا سلجھا انداز وروانی، بیان کی شگفتگی اور شعریت سبھی کچھ موجود ہے۔

کٹے کیسے افسردہ تاروں کی لو میں بہت ہی بھیانک رتوں کا سفر ہے
یہ کیسا سمندر ہے پلکوں کے پیچھے جو رکھتا مری آنکھ کو تر بہ تر ہے
اہل دنیا کو یہ برا سا لگے چہرہ جب بھی مرا کھلا سا لگے

میں نے جو سطور تحریر کی ہیں وہ میری ذاتی رائے ہے۔میری اردو زبان کے حوالے سے معلومات محدود ہیں۔ ویسے بھی تخلیقی کام میں کسی فرد کی آرا حرف آخر نہیں سمجھی جاتی ہے۔اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کو فن کے حوالے سے لوازمات سے درکنار رکھنے کی رعایت نہیں دی جاسکتی ہے۔اس طرح کی فراخ دلی خود اس زبان کے لئے نقصان دہ

ثابت ہوسکتی ہے۔" آئینہ ءخیال" کوفن کی کسوٹی پر پرکھتے وقت بھی شاعرہ کواس بات رعایت نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ ایک خاتون ہیں۔اردوجیسی زبان میں جہاں اساتذہ نے لسانی معیارکوکافی بلندی سے نوازا ہے۔کسی بھی طرح کی درمیان داری کی کوئی گنجائش موجودنہیں ہے۔اگرادبی کسوٹی پرکوئی تخلیق کھری اترتی ہے، وہی شاہکار بن جاتی ہے۔لیکن ایک حقیقت پسند نظریہ اپنانے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ تخلیق کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہےاور نئے نئے تجربات کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔یہی بات نوآموزشعرا کے لئے نئے دروازے کھول دیتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ" آئینہ ءخیال" ہماری ریاست کےادبی منظرنامے کوضرورمتاثر کرے گا۔

☆☆☆

Rubina Mir ki Shairi " Tafseer-e-Hayat" ke Aayine mein by Wali Muhammad Aseer Kishtwari (Kishtwar)

ولی محمد اسیر کشتواڑی (کشتواڑ)

روبینہ میر کی شاعری "تفسیر حیات" کے آئینے میں

راجوری اور پونچھ کی مردم خیز سرزمین سے ابھرنے والی تیز قلم شاعرہ روبینہ میر کا دوسرا شعری مجموعہ "تفسیر حیات" ان کے اولین مجموعے "آئینۂ خیال" کے صرف تین سال بعد زیور طبع سے آراستہ ہو کر اردو شعر و سخن کے پروانوں تک پہنچ گیا ہے۔ یہ محنت اور سرعت اس حوصلہ افزائی کا ثمرہ ہے جو لوگوں نے ان کی پہلی کتاب کو پڑھ کر زبانی اور تحریری طور پر کی ہے۔ 2015 میں تازہ تازہ چھپی ہوئی "تفسیر حیات" تکنیکی اور معنوی اعتبار سے بلا شبہ "آئینۂ خیال" سے بہتر اور خوبصورت کتاب ہے۔ یہ اس لگن اور دلی جذبے کی دین ہے جس نے پر آشوب حالات میں پلی بڑھی ایک جواں سالہ خاتون کو لب کشائی پر مجبور کیا۔ شاعرہ کی شاعری میں اس ماحول کا ہی قدم قدم پر عمل دخل ہوتا ہے جس ماحول میں اس نے پرورش پائی ہوتی ہے۔ چنانچہ روبینہ میر کے سسرال اور مائکے دونوں ادبی خدمت کے لئے سازگار ہیں۔ وہ ادھر ادھر کی تنقید کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حقائق کی لفظی تصویریں کھینچ کھینچ اپنے شوق سخن کو پروان چڑھا رہی ہیں۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ایک بڑے پولس آفیسر کی شریک حیات ہونے کے باوجود وہ بڑی بے باکی سے شاعری کر رہی ہیں اور لوگوں کی میٹھی اور کڑوی باتیں سن کر ذرہ بھر بھی نہیں گھبراتیں۔ پیشہ تو درس و تدریس کا ہے لیکن شاعری کی دنیا میں وہ اکثر صنف نازک کی ایک رہبر اور ترجمان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

"تفسیر حیات" میں شامل تخلیقات کا انہماک کے ساتھ مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ روبینہ میر کی اردو شاعری ان کے لئے ایک منفرد اور اعلیٰ مقام پیدا کرنے میں مصروف عمل ہے اور اگر ڈاکٹر نذیر آزاد، ایاز رسول نازکی، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اور محمد یوسف ٹینگ صاحب جیسے شہباز نظر اصحاب قلم انہیں بطور اردو شاعرہ تسلیم کر رہے ہیں تو اس سے بڑھ کر ان کی کامیابی اور کامرانی کی کیا علامت ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک یہ ان کے سچے اور پاک جذبوں کے والہانہ اظہار کا کرشمہ ہے۔ اس تناظر میں روبینہ میر نے جو سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا عزم کیا

ہے وہ بجائے خود ایک مستحسن قدم ہے۔

ہم سچ کو سچ ہی کہتے رہیں گے — جو بھی ستم ہو سہتے رہیں گے

"تفسیر حیات" کو اگر میں روبینہ میر کی تفسیر ذات کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیوں کہ ان کی شاعری ہر اعتبار سے ان کی شخصیت، بلند خیالی اور ندرت بیانی کی غماز ہے۔ موصوفہ کی طبیعت شاعری کے لئے کافی موزوں ہے۔ اس لئے ان کے قلم کی روانی میں روز بہ روز تیزی آ رہی ہے۔ غیر مطبوعہ شعری مجموعوں کا عندیہ اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ روبینہ ہر سال کم سے کم ایک مجموعہ ء کلام نکالنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں جلد بازی میں ان کے کلام کی عوامی مقبولیت کسی نقطے پر پہنچ کر منجمد نہ ہو جائے۔ اس ضمن میں انہیں جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب کے الفاظ، ہر ہر جملے کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ:

" وہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ سے اشعار منتخب کرنے کی روش سیکھیں جن کا مختصر سا دیوان شاید اردو کا سب سے روشن فانوس بن گیا ہے"۔

جناب ایاز رسول نازکی اور جناب ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے روبینہ میر کی شاعری کے اوصاف بطریق احسن ابھارے ہیں، جن کی روشنی میں "تفسیر حیات" کو اردو شاعری کے بیش قیمت خزانے میں ایک اچھا اضافہ قرار دینا حق بجانب ہی ہوگا۔ پیر پنچال کی یہ خوش نوا بلبل نغمہ ء زن ہو کر بارگاہ الٰہی میں یوں دست بہ دعا ہے۔

ملے مجھ کو منزل یہ ممکن نہیں ہے — نہ جب تک ہو تیری رضا میرے مولیٰ
رہ زندگی میں کئی پیچ و خم ہیں — مجھے سیدھا رستہ دکھا میرے مولیٰ

"تفسیر حیات" میں کل 79 غزلیں، 20 دعا، 49 نظمیں اور 2 متفرقہ اشعار موجود ہیں۔ روبینہ میر ایک مومنہ ہونے کے ناطے دربار الٰہی میں بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ آرزو کرتی ہیں۔ دونوں دعائیں اگر چہ ایک کا عنوان "تمنا" دیا گیا ہے، بڑی جامع اور پر اثر ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ دل سے نکلنے والی ان دعاؤں کو ضرور شرفِ قبولیت حاصل ہوا ہوگا کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے ستر ماؤں سے بھی زیادہ ہمدردی رکھتا ہے۔ ان دعائی اشعار کو آپ بھی پڑھئے اور حقیقت حال کا اندازہ کیجئے :

خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے برابر — بخش دے مری ہر خطا میرے مولیٰ
کہے تو کسے حال دل کا روبینہ — نہیں کوئی تیرے سوا میرے مولیٰ

گلستاں کو بہار دے یا رب — ہر کلی کو نکھار دے یا رب
ہر طرف مشکلوں کی ہے یلغار — میری قسمت سنوار دے یارب
تجھ سے روبینہ کی گزارش ہے — سب کے دل کو قرار دے یارب

روبینہ کی غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ انہوں نے بعض ایسے اشعار کہے ہیں جن میں ان کی مادہ پرستی اور ظاہری دبدبے سے دلی نفرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ دنیاوی زندگی کوئی دائمی زندگی نہیں ہے، اس لئے انسان کو روپے پیسے اور اقتدار کے لالچ میں آ کر اپنی آخرت کی زندگی کو برباد نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ خون پسینے کی محنت سے بنائی ہوئی معمولی سی جھونپڑی میں جو سکون ملتا ہے وہ آسمان سے باتیں کرنے والے بلند و بالا محل میں میسر نہیں ہوتا۔ یہاں شاعرہ کا وہ صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے جس کی وہ قائل ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ان کے یہ شعر توجہ طلب ہیں:

ہمیں مال و زر سے نہیں کوئی رغبت — نہ اس کی کبھی ہم نمائش کریں گے
روبینہ جنم سے ہی درویش خو ہیں — کسی جھونپڑی میں رہائش کریں گے
سکوں وہ ملے گا کسی جھونپڑی میں — جسے محلوں کے درمیاں ڈھونڈتے ہیں

کرائے کے ان عالی شان محلوں سے ہے یہ بہتر
تم اپنے جھونپڑوں کو ہی سجاؤ گے تو اچھا ہے

روبینہ میر کی غزلوں میں درد و غم کا رنگ بھی ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے درد بھری باتیں فنکارانہ انداز میں ضبط تحریر میں لانا ہی ایک بڑا موثر قدم ہے۔ انہیں قدم قدم پر دکھوں سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں جو ان کے دل کو پگھلا کر شعری قالب میں ڈھال کر ایک ہیجانی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ اپنے درد و غم کی داستان کو وہ مختصر لفظوں میں بیان کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتی ہیں۔ زبان کی سادگی اور غیر ضروری تشبیہات و استعارات سے ہر ممکنہ اجتناب قاری کے لئے باعث کشش چیزیں ہیں جو روبینہ کی شاعری کو مقبول عام بنانے میں ممد و معاون بن رہی ہیں۔ اس قبیل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آسماں نے بانٹے ہیں دنیا میں سکھ — درد سب کا میرے اندر رکھ دیا
ہم پہاڑوں سے بھی ٹکرائے مگر — توڑ کر خود اپنا ہی سر رکھ دیا

روبینہ میر کی غزلوں کا عشقیہ آہنگ بھی دلکش و دل پذیر ہے۔ انہوں نے سچی اور پاک

محبت کی جو تصویر کشی کی ہے، وہی ان کے پاکیزہ خیال ہونے کی دلیل ہے۔ روایتی موضوعات کو وہ نئے انداز سے پیش کرتے کرتے جدید شاعری سے متعلق اپنی جانکاری کا بھی احساس دلاتی ہیں۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کا ایک ایسا امتزاج ہے جو دن بہ دن حسین سے حسین تر ہوتا جا رہا ہے مثلاً:

میں نے سوچا بھی نہ تھا میں ڈھونڈتی رہ جاؤں گی
خواہشوں کی بھیڑ میں دل لاپتہ ہو جائے گا
مسکرا کر دیکھنا اس میں بھی تھا اک معجزہ
اس سے لیکن درمیاں میں فاصلہ ہو جائے گا

روبینہ میر ذرائع ابلاغ اور مطالعہ کتب کی وساطت سے کرہء پر رہائش پذیر انسانوں میں اخلاق اور کردار کی کمی دیکھ کر مضطرب ہو رہی ہیں۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتی ہیں کہ اس سائنسی دور میں انسان عملی طور پر ایک مشین بن کر رہ گیا ہے جس میں انسانی ہمدردی کا عنصر آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب انہیں نظام تعلیم میں کردار سازی اور روحانیت پروری کی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کی بنا پر انسانوں پر دھڑا دھڑ ظلم و ستم ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے ردِعمل کے ساتھ یوں رطب اللسان ہوتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

دشمنی ہی دشمنی ہے ہر طرف
آگ نفرت کی لگی ہے ہر طرف
کس نے یہ جینا اجیرن کر دیا
خوف، دہشت، سنسنی ہے ہر طرف
ہر کسی کی سمجھ سے باہر ہے
دنیا میں چل پڑی ہوا ایسی
کام لیتے رہے حقیقت سے
کی خطا ہم نے بارہا ایسی
جو نبھے اقرار ہونا چاہئے
انسان کا کردار ہونا چاہئے
اس سے ملتی ہے زمانے کی خبر
اس لئے اخبار ہونا چاہئے

روبینہ میر کی نظمیں ان تمام حالات کا آئینہ ہیں جن سے دور حاضر کی خواتین بری طرح دو چار ہیں۔ ان نظموں میں وہ ساری باتیں کرتی ہیں جو وہ غزل میں نہیں کہہ پا رہی ہیں۔ ان کی نظمیں مختصر اور آزاد نظمیں ہیں۔ جس قدر وہ ایک پابند غزل لکھ رہی ہیں، اسی قدر ان کی نظم روایت سے باغی دکھائی دے رہی ہے۔ ان منظومات میں جدت ہی جدت ہے۔ بعض نظمیں پسند آئیں ان میں جھٹکا، درد کا احساس، صنف نازک، ماں، بددعا، چڑھتے سورج کو سلام، التجا، پیغام، احساس ندامت، وجہ

،عارضی رہائش، رشتہ ٹوٹ گیا اور خواب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔نظم" رشتہ" روبینہ میر کی ایک من پسند تخلیق ہے، وہ اس طرح ہے۔

وہی۔۔۔۔
تو میرا ابھی ہے۔۔۔
تم سے۔۔۔۔
جو۔۔۔۔۔
روح کا بدن سے
رشتہ۔۔۔۔۔

مجموعی طور پر" تفسیر حیات" کی روشنی میں روبینہ میر اردو غزل اور نظم کی ایک پر گو شاعرہ کی حیثیت سے جلوہ افروز ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی بسیار گوئی بسا اوقات ان سے ایسے شعر کہلواتی ہے جوان کے قائم کئے جانے والے معیار کے شایان شان نہیں ہیں۔جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب نے بھی اپنے پیش کلام میں اشارتاً لکھا ہے۔لہذا مصنفہ کو سوچ سمجھ کر کسی نئے مجموعے کو ترتیب دینا ہوگا۔ان کا تخلیقی سفر ابھی زیادہ طویل نہیں ہے لیکن اچھا آغاز آدھی کامیابی قرار دیا گیا ہے۔انہیں ابھی کام کرنے کے لئے ساری عمر باقی ہے لہذا میں یہی مشورہ دوں گا کہ وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھائیں تا کہ وہ عملاً وقت کی ایک معتبر آواز بن سکیں۔

ہر مصنف کو یہ بات بھی ذہن نشیں ہونی چاہئے کہ سب سے بڑا ناقد اور قدر داں ان کا قاری ہی ہوتا ہے۔اس لئے دو دو تین تین دیباچے لکھوا کر انہیں اسناد جمع کرنے سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔آخر میں" تفسیر حیات" کے مرتبین شفیق میر اور انجینئر ریاض کوثر کول کو بھی یہ بات گوش گزار کرانا چاہوں گا کہ انہوں نے اتنی خوبصورت کتاب میں ایک باریک فاؤنٹ کی فہرست دے کر داغدار بنا دیا ہے جس سے وہ مقصد ہی فوت ہو گیا جس کے لئے ہر کتاب کا انڈکس مرتب کیا جاتا ہے۔بہر حال میں" تفسیر حیات" کو ایک دلکش اردو شاعری کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے روبینہ میر کے ہی اس شعر کے ساتھ بات ختم کرتا ہوں کہ:

ہوگئی چپ سی میں بھی روبینہ
میری باتوں میں جب اثر آیا

☆☆☆

زنفر کھوکھر (راجوری)

روبینہ میر: بحثیتِ شاعرہ

روبینہ میر ایک علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔اور ایک اچھی شاعرہ ہیں۔شاعری کی صلاحیت ان کی گھٹی میں شامل تھی۔جسے شاید ایک مناسب وقت کا انتظار تھا۔اپنی پڑھائی لکھائی دنیا داری کے دیگر کام کاج اور اپنی اہم سماجی ذمہ داریوں سے فارغ ہوتے ہی اُن کی شاعرانہ صلاحیت اُبھر کر سامنے آگئی۔شاعری کی دُنیا میں ریاستی سطح پر روبینہ میر کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔اگرچہ اُن کی شاعری کی عُمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔مگر اُن کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں اُنھوں نے جو نام اور شہرت حاصل کی ہے۔وہ حاصل کرنے میں بعضوں کو مُدتیں لگ جاتی ہیں۔اور بعض مدتیں گزر جانے کے باوجود بھی گُمنام رہتے ہیں۔بہت تھوڑے عرصے میں بہت زیادہ نام وشہرت پانے کی پہلی وجہ تو یہی ہے۔کہ روبینہ میر اچھی شاعرہ ہیں۔اور وہ اچھے شعر تخلیق کرتی ہیں۔اُن کے چند شعر ملاحظ فرمائیں:

چند سانسوں کا یہ سارا کھیل ہے — زندگی کس پر ہے اِترائی ہوئی
مُشکل ہے کہ رہ پائیں گے یہ دونوں سلامت — پگڑی کو بچاؤ گے تو پھر سر نہ ملے گا
سو غم بھی اُٹھا کر مجھے ہوگی نہ شکایت — مُجھ سا کوئی بھی رنج کا خوگر نہ ملے گا

روبینہ میر اور میں گزشتہ چند برسوں سے اپنے ادبی زوق کی بدولت ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔میری نظر میں روبینہ میر اچھی شاعرہ ہی نہیں بلکہ اچھی انسان بھی ہیں۔ہمت وحوصلے والی ہیں۔با اخلاق اور اعلیٰ قدروں کی پاسدار ہیں۔انسان دوستی میں یقین رکھتی ہیں۔مہمان نواز اور احباب پسند ہیں۔وہ خود کہتی ہیں:

آنکھوں پہ میں نے اُس کو بٹھایا خوشی خوشی — جو بھی کوئی میرے گھر میں آیا خوشی خوشی
تو ہندو بن کے جی نہ مسلمان بن کے جی — جینا ہے زندگی میں تو انسان بن کے جی
یاد رکھئے ہے اخلاق بھی کوئی شے — جب کسی بات کی انتہا کیجئے

روبینہ میر اپنے فین کی طرف سے کی جانے والی ستائیش اور تعریف وتوصیف کا والہانہ خیر مقدم کرتی ہیں۔اُن کے ساتھ برابر رابطے میں رہتی ہیں۔اسی طرح وہ اپنے ہم عصر شعراء واُدباء کے

ساتھ بھی اپنے ادبی تعلقات برابر بنائے رکھتی ہیں. وہ کہتی ہیں:

چراغ راہ میں اکثر جلائے رکھتی ہوں ہوائے تند سے بھی رشتہ بنائے رکھتی ہوں

روبینہ میر کو اُن لوگوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا جنہیں نہ ستائیش کی تمنا نہ صِلے کی پرواہ ہوتی ہے. ظاہر سی بات ہے. کوئی کتنا ہی بڑا اور ہنر مند کیوں نہ ہو. اگر وہ دوسروں کے ساتھ کسی "لے"" دے" میں نہیں ہے تو اُس کی اچھائی اور بڑائی کا دوسروں کو کم ہی علم ہو پاتا ہے. اپنے ہُنر اور کمال کے ساتھ ساتھ انسان کو دوسروں کے تعاون اور راہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے. اس ضمن میں روبینہ میر خوش قسمت ہیں. کہ انھیں اپنے والدِ محترم جناب عبدالسلام میر جن کا صحافت کی دُنیا میں اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ اور نام ہے، کی راہنمائی حاصل ہے. اور ساتھ ہی ساتھ نشرو اشاعت کے سِلسلے میں صحافت سے ہی جڑے اپنے بھائی شفیق میر کا تعاون بھی حاصل ہے. اور سب سے بڑھ کر انھیں اپنے شریکِ حیات جناب فرید صاحب جو کہ محکمہء پولیس میں اس وقت ایس, ایس پی کے عُہدے پر فائز ہیں کا تعاون اور سرپرستی حاصل ہے۔ یہ سبھی باتیں اچھی ہیں. اور سراہے جانے کے قابل ہیں. میرے خیال میں روبینہ میر کی شعری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ یہ سبھی باتیں اور بالخصوص ان کی انسان دوستی اور قدر شناسی بھی اُن کی شہرت کی ضامن ہے۔

جن شعراء واُدباء نے روبینہ میر کی شاعری کو تسلیم کیا اور سراہا ہے. اُن کی فہرست کافی لمبی ہے. سرِ فہرست شاعری کی دُنیا کا ایک معتبر نام عرش صہبائی کا ہے. عرش صہبائی نے روبینہ میر کے پہلے شعری مجموعہ آئینہءخیال کا دیباچہ لکھتے ہوئے اسے ایک صحت مند شعری مجموعہ کہہ کر ایک نئی شاعرہ کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اُردو دُنیا کے نامور ادیب وتنقید نگار جناب محمد یوسف ٹینگ نے روبینہ میر کے دوسرے شعری مجموعے کا دیباچہ لکھتے ہوئے اُن کے لفظوں کو بے حد پسند کیا ہے. اور مفید مشورے بھی دئے ہیں۔ ریاست کے جانے مانے شاعر میر ایاز رسول نازکی نے "روبینہ میر ایک تاثر" عُنوان کے تحت مضمون لکھ کر اس اُبھرتی شاعرہ کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ ضلع پونچھ کے جانے مانے شاعر محمود الحسن محمود نے روبینہ میر کی شعری صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کے حق میں زورِ قلم اور زیادہ ہونے کی دُعا دی ہے۔

تحریک ادب کے مدیر جاوید انور نے روبینہ میر کی شاعری کو اُردو ادب کی معیاری شاعری میں ایک اضافہ کا درجہ دیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے روبینہ میر کی شاعری کے اعتراف میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ ریسرچ اسکالر امتیاز وانی نے اپنی نظر میں روبینہ میر کی شاعری کو اِلہامی

شاعری کا درجہ دیا ہے۔ انجینئر اسلم شہزاد نے" روبینہ میر کی شعری کائینات "عنوان کے تحت اپنے خوبصورت مضمون میں جہاں روبینہ میر کی شعری صلاحیتوں کو سراہا ہے. وہیں بعض تبصرہ وتجزیہ نگاروں کو بھی اپنی نیک رائے سے نوازا ہے.ان کا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو کیا نہیں ہے روبینہ میر کی شاعری میں۔ اُنھوں نے مختلف النوع موضوعات کو شاعرانہ رنگ دیا ہے. روحانیت کے متعلق اُن کا شعر ملاحظہ کیجئے:

زندگی میں جو بھی تیرے در کے سائل ہو گئے زندگی میں ہر مصیبت سے ملی اُن کو نجات

روبینہ میر چونکہ مخلص اور صاف گو ہیں. یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خامیوں کا بھی برملا اظہار کرتی ہیں. وہ کہتی ہیں:

جب کبھی جزبات میں بہتی ہوں میں
میں کسی کا پھر نہیں کرتی لحاظ

دیکھا جائے تو یہ اشعار کسی پر بھی صادق آسکتے ہیں:

مجھے اس بات کا بھی غم نہیں ہے میرا اپنا کوئی ہمدم نہیں ہے
زمانے کو بُرا کیونکر کہوں میں اچھائی کا یہیں موسم نہیں ہے
تمھیں معلوم کیا اُس پہ جو گزری بظاہر آنکھ جس کی نم نہیں ہے

روبینہ میر چونکہ اعلیٰ قدروں کی پاسدار ہیں. اُنھیں اگر کسی سے کوئی شکایت ہے تو اس میں بھی ایک سلیقہ نظر آتا ہے. ملاحظ کیجئے اُن کی نظم" مقام ومرتبہ"۔

تیری ان گنت
خواہشوں میں
تیری ان گنت
چاہتوں میں
میری عزت
میرا احترام
میرا مقام-----کہاں پر ہے؟
نمبر ایک
نمبر دو
یا پھر---

نمبر تین پر----

روبینہ میر کا شعر ہے:

ابھی تو گھر بھی جانا ہے　　　ابھی تھا باہر کا معاملہ

اس شعر کی سادگی دیکھیے.اور معنی کی گہرائی دیکھیے.ایک احساس ہے جو سب پر صادق آتا ہے.سب کے احساس کی ترجمانی کرتا ہے.یہی شعر کی خوبی ہوتی ہے۔شعر کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے.کہ شعر آسان سا لگے.اور جب آدمی کہنے کی کوشش کرے.تو مُشکل پیش آئے.روبینہ میر کی شاعری میں ایسے اشعار جابجا نظر آتے ہیں۔یہ بھی مانا گیا ہے کہ شعر ضرورت سے زیادہ الفاظ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ہے.یعنی اگر شعر کا مفہوم کسی لفظ کے بغیر ہی ادا ہو جائے تو وہ لفظ نکال دیا جانا چاہئے.اس نقطہءنظر سے اگر دیکھا جائے تو روبینہ میر کی شاعری میں کہیں کہیں پر اِس ,اُس ,اگر ,مگر جیسے اضافی الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔مجموعی طور روبینہ میر کی شاعری تشبیہات واستعارات سے دور ایک عام فہم شاعری ہے.جس میں سادگی اور روانی بھی ہے.وہ ایک جگہ کہتی ہیں:

زندگی جینا ہے مُشکل اور مرنا سہل ہے　　　زندگی خود حال اپنا کہہ رہی ہے ہر طرف

بہر حال یہ طے ہے کہ مزید بہتری کی گنجائش موجود رہتی ہے.بقول انجینئر اسلم شہزاد "تخلیقی کام میں کسی بھی فرد کی آرا حرفِ آخر نہیں ہو سکتی"۔

اپنی شعری خوبیوں کے ساتھ ساتھ روبینہ میر شخصی طور پر کئی خوبیوں کی حامل ہیں.میں یہاں اُن کی اس خوبی کا بطورِ خاص زکر کرنا چاہوں گی.کہ وہ لفظ شناس ہونے کے ساتھ ساتھ چہرہ شناس بھی ہیں.چہرہ شناسی کی بدولت وہ انسان کی اندرونی کیفیات کا ادراک رکھتی ہیں.اپنے آس پاس سے باخبر رہتی ہیں.آنکھیں اور کان کھلے رکھتی ہیں.رمز و کنایہ میں کی جانے والی باتوں کا خوب نوٹس لیتی ہیں.ایک ماہرِ نفسیات کی طرح دور کی نظر رکھتی ہیں.ان سبھی خوبیوں کا عکس اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

☆☆☆

Rubina Mir "Izteraab" ke Aayine mein by Dr. Nilofar Naaz Nahvi

ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی

روبینہ میر ''اضطراب'' کے آئینہ میں

نسائی ادب دو معنی میں رائج اور استعمال ہوتا ہے۔ایک وہ جو خواتین کے قلم سے منصۂ شہود پر آتا ہے اور اس میں خواتین اپنے تجربوں،طرز زندگی،مشاغل، یا مذاق یا دوسرے جذبات یا احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔خواہ وہ شاعری ہو یا نثر۔اور دوسرا وہ ادب ہے جو خواتین سے متعلق ہو۔جس میں خواتین کے مسائل،انکی خواہشات،انکے طرز زندگی یا انکے مقاصد پر بات ہو۔یا خواتین سے متعلق کوئی بھی مسئلہ ہو۔یہ ضروری نہیں کہ ان کی خالق خواتین ہی ہوں بلکہ انکے تخلیق کار مرد حضرات بھی ہو سکتے ہیں۔یہ سارا نسائی ادب کہلاتا ہے۔روبینہ میر کشمیر کی ایک ایسی بیٹی ہے جس کا دل درد سے بھرا ہے اور وہ بھی نسائی ادب کی علم بردار ہیں۔آپ کا دل کبھی بیٹیوں،کبھی یتیموں اور بیواؤں تو کبھی ستم رسیدہ خواتین کیلئے تڑپ اٹھتا ہے۔کبھی بوڑھے والدین کو بچوں کے انتظار میں دیکھ کر ان کا دل کڑھتا رہتا ہے اور کبھی وہ لوگوں کو اپنی انا کی خاطر مر مٹنے کو تیار دیکھتی ہے،تو کبھی وہ نوجوانوں کو وقت کا زیاں اور بے قدری کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔کبھی وہ عورت ذات پر ظلم و تشدد دیکھتی ہے تو کبھی حوا کی بیٹی پر عصمت دری اور درندگی کے حملے کو دیکھ کر بے چین اور بے قرار ہوتی ہے۔

روبینہ میر کی کتاب ''اضطراب'' کا انتساب بھی ''بنت حوا کے نام'' ہے۔''اپنی دونوں بیٹیوں ''آشو'' اور ماریہ'' کے علاوہ حوا کی اس بیٹی کے نام جس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ ہے۔ان کے سامنے بنت حوا کا دوسرا نام بے بسی ہے،مجبوری اور لاچاری بھی۔عورت کے لئے اگرچہ women empowerment کے بڑے بڑے نعرے لگائے جاتے ہیں اور اسکو طاقتور بنانے کے لئے بڑے بڑے نقارے بجادئے جاتے ہیں مگر عورت جہاں تھی وہیں پر ہے۔آغا نیاز مگسی صاحب روبینہ میر کی شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''روبینہ میر ایک ایسی شاعرہ ہے جس کی زندگی کا زیادہ تر وقت اپنے آپ کو یا اپنی ذات کی تلاش کرنے،اپنے دل کو ڈھونڈنے اور مظلوم عوام کے ساتھ ساتھ خاص طور پر مظلوم اور بے بس خواتین کے جائز حقوق کے بارے میں جدو جہد کرتے گذر رہا ہے۔'' چنانچہ روبینہ فرماتی ہیں:

راستے میں قدم قدم پر
آدم زاد بھیڑیوں سے
میرا سامنا ہوتا رہا
جو چہرے بدل بدل کر آتے
مجھے ڈراتے
اکیلا دیکھ کر
فائدہ اٹھانا چاہتے تھے
میری تنہائی کا
میرے عورت ہونے کا
شاید وہ جان چکے تھے کہ بنت حوا کا دوسرا نام ہے بے بسی، مجبوری لاچاری ☆ص ۴۰

شاعرہ اس وقت اس مرد ذات سے متنفر ہوتی ہے جو بھیڑیے کی شکل میں آتا ہے اور نسوانیت کی پاکیزگی کو تار تار کر دیتا ہے۔ اور اسکو اپنے پیروں سے روند ڈالتا ہے۔ ورنہ زندگی کی گاڑی ایسی ہے جو صرف خواتین کے بل بوتے پر نہیں چل سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی ایک جوڑی بنائی ہے جو ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ جن کو ایک دوسرے کا انتظار رہتا ہے۔

کبھی تم دیر مت کرنا
میں روٹھوں تو منانے میں
مجھے واپس بلانے میں
چراغ دل جلانے میں
اندھیروں کو مٹانے میں
دیار دل بسانے میں
کہ میرے پاس آنے میں
کبھی تم دیر مت کرنا ☆ص ۲۴

روبینہ میر ایک ایسی خوددار خاتون ہیں جو زندگی میں مشکلوں کے باوجود بھی اپنے آپ کو کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیتی۔ راجوری پونچھ کی یہ خوددار شاعرہ جس کا اصل نام روبینہ اختر میر ہے۔ وہ اپنی بہنوں اور تمام خواتین کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ چاہے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آئیں سر کو کبھی نہ جھکنے

دیں۔

نہیں جھکے گا کبھی مشکلوں سے سر میرا　　　تمام عمر رہے گا رواں سفر میرا

کسی کی آنکھ سے آنسو کی مثل بہتی ہوں　　　کسی کے لب پہ ہے ذکر سر بسر میرا

عورت جس طرح رسم ورواجوں میں بندھی ہوئی ہے کبھی کبھی اس کا دل اس سے فرار چاہتا ہے۔مگر چاہنے کے باوجود بھی وہ ان زنجیروں کو نہیں توڑسکتی ہے۔وہ چاہے کتنی بھی آزاد ہومگر وہ نام کی آزاد ہے۔چنانچہ لکھتی ہیں:

میں قید ہو کے رہ گئی رسم ورواج میں　　　ڈالی جو اس نے پاؤں میں زنجیر کیا لکھوں

اک پل بھی زندگی میں میسر نہیں سکوں　　　میں اس کو اپنی شومئ تقدیر کیا لکھوں

☆☆

ہم کو لے ڈوبی ہماری سادگی　　　بے خطا ورنہ سزا پاتے نہ ہم

کشمیر پچھلی کئی دہائیوں سے ایک نئی مصیبت سے جوجھ رہا ہے۔جس نے ماں باپ کو بیٹوں سے الگ کر دیا ہے، بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کر دیا ہے۔انسان کا لہو کسی بھی گئی گزری مخلوق کے خون سے سستا ہے۔انسانوں کی لاشیں بے کفن پڑی ہوئی ہیں اور پوچھنے والا کوئی نہیں۔

ہے بہت ارزاں لہو انسان کا کشمیر میں　　　عزت و ناموس جان وآبرو کشمیر میں

ہر طرف آہ وبکا اور بستیاں ماتم کدہ　　　ہیں جنازوں کی نمازیں چارسو کشمیر میں

کشمیر کے حالات کے تناظر میں جب شاعرہ بات کرتی ہے تو بہو بیٹیوں کا وہی خوف جو ان کو گھر سے نکلتے ہوئے لاحق ہوتا ہے انہیں مغموم کر دیتا ہے۔کشمیر جواب بالکل عورتوں اور بیٹیوں کیلئے محفوظ نہیں ہے۔یہاں نہ کنواریاں محفوظ ہیں اور نہ ہی مستورات۔انسانوں کی بستی ہو یا جنگل ہو بھیڑیوں کا خوف دلوں پر چھایا رہتا ہے۔اسی بات کو شاعرہ اسطرح بیان کرتی ہے۔:

گھپ اندھیرے میں
صحیح سلامت
ان آدم زاد بھیڑیوں سے بچ کر
شہرو دیہات سے گذر جاؤں
انسانوں کی بستی سے نکل کر
جنگل تک پہنچ جاؤں

تو میری جان بچ سکتی ہے

ورنہ کیا معلوم؟ کب؟ کہاں۔۔۔۔۔؟☆☆

جہاں ظلم و تشدد ہو۔خواتین بھی غیر محفوظ ہوں۔بچوں اور نوجوانوں پر بھی خوف مسلط ہو۔وہاں کا شاعر اور مصنف اس کے بغیر کیا لکھ سکتا ہے کہ:

اس دیش کا آخر کیا ہوگا

جہاں انسان کو انسان نوچے

جہاں اک دوجے کو ملیں دھوکے

جہاں رہ جائیں سب رو رو کے

اس دیش کا آخر کیا ہوگا

اسی کے ساتھ ساتھ روبینہ جی اس بات سے بھی فکر مند ہیں کہ یہاں رشتوں کی قدر گھٹ گئی ہے۔ماں باپ بہن بھائی اب کوئی کسی کا نہیں ہے۔ماں باپ بوڑھے ہوتے ہیں تو ان کو گھروں میں یا تو رہنے نہیں دیتے یا ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔بہن بھائیوں کا وہ پیار جو ایک زمانے میں مر مٹنے پر تیار تھے مگر آج ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں:

ایک ہی ماں کی کوکھ سے

جنم لینے کے باوجود

ایک ہی گھر میں ساتھ ساتھ

پلنے بڑھنے کے باوجود

ایک ہی آنگن میں کھیل کر

جوان ہونے کے باوجود

وہ میرے لئے کس قدر اجنبی ہو گیا (نظم" بھائی")

روبینہ کے جو شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں،ان میں آئینہ خیال،تفسیر حیات،حرف راز،نوید قلم اور اب اضطراب سامنے ہے۔نعیم جاوید صاحب اضطراب کے حوالے سے سعودی عرب سے لکھتے ہیں:

''روبینہ میر کی شاعری کسی بڑے دعوے کے بجائے زندگی کی سادہ سچائیوں کا صد رنگ گلدستہ ہے۔حیات بخش موضوعات اور جان لیوا منظروں کا میوزک ہے۔انکے ہر شعر پر لاکھ صناعی سے سجی

جھوٹی شاعری قربان کی جاسکتی ہے کیونکہ انہوں نے سچائیوں کو سمیٹ کر رکھا ہے اور یہی درد ہے جس کی توسیع ممکن ہے۔''

اسی صد رنگ گلدستے میں سے ایک گل آج کے دور کے انسان کی انا ہے جو اپنی انا کی خاطر ایک دوسرے کے آگے جھکنے سے روکتی ہے۔ یہ انا ہے جو آپ کسی سے معافی نہیں مانگ سکتے۔ یہ انا ہی ہے جو آپ کو اپنا بڑا پن چھوڑنے نہیں دیتی۔ وہ بھی انا ہی تھی جب شاعر فیض احمد فیض نے کہا:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

وہ انا کی وجہ سے ہی انہیں ناگوار گذری ہے۔ آج کے دور میں اسکا زیادہ ہی چلن ہے۔ انا کو ٹھیس بہت جلدی لگتی ہے اور آپ کو معافی مانگنے سے روکتی ہے غلطی چاہے آپ ہی کی کیوں نہ ہو۔

قصور اگر ہے تو
ہماری انا کا ہے
جو ہمیں
ایک دوسرے کے آگے
جھکنے سے روکتی ہے۔ (نظم "قصور")

کس کس بات اور موضوع کا ذکر کریں جس کو شاعرہ نے چھیڑا نہیں۔ شاعرہ نے طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ اور شاعری میں ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف نظمیں اور غزلیں کہیں ہیں بلکہ حمد، نعت اور منقبت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ہمیں ان کی شاعری میں فن کی باریکیوں کو ڈھونڈنے کے بجائے ان کے مضامین کو دیکھنا چاہئے کہ کن کن خیالات اور احساسات کو انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ خود روبینہ میر کے الفاظ کو ہی ہم یہاں پر دہراتے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں: ''میں نے بعض اوقات فن کی باریکیوں کی پرواہ کئے بغیر سماج کی اخلاقی پستی کی نقاب کشائی کرنے کی سعی کی ہے۔ میں اپنے خیالات اور احساسات کو محتاج عروض نہ کر سکی۔ میری شاعری میں آپ کو روایتی حسن و عشق کا تذکرہ بہت کم دیکھنے کو ملے گا۔ میری کوشش رہی ہے کہ میں معاشرے کی تلخ سچائیوں کا عکس و آہنگ پیش کر سکوں۔''

ڈاکٹر مرزا شفیق حسین صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لکھنو روبینہ جی کی شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ان کی شاعری مظلوموں کی آہ و فغان، یتیموں کے نالہ و شیون اور بیواؤں

کی آہ وزاری سے عبارت ہے۔ یہ اس وقت شعر کہتی ہیں جب کسی یتیم کی چشم خون بستہ سے آنسو ٹپکتے ہیں جب کسی دلہن کی مانگ میں افشاں کی جگہ لہو چھڑکا جاتا ہے۔''

شہباز کشمیری انکے کشمیری مجموعے ''نویدِ قلم'' کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں۔ترجمہ۔

''روبینہ میر کی شاعری عصری اور تازہ ہے۔اس میں ہمارے جھرنوں، آبشاروں کا شور بھی ہے اور ترنم بھی۔اور سبزہ زاروں کی دلکشی بھی ہے۔کشمیر کا راز اپنی یاداشت میں محفوظ کر کے جمالیاتی تناظر میں احساسات کا بسیار جہات پر مشتمل وجود مقامی اور عالمی منظر ناموں کا نسوانی عکس، محسوسات، مجبوریاں، موجودہ خونین مناظر کا اشارہ، اور کیا کچھ نہیں جو اس کے تخیل زار میں موجود نہیں۔''

آخر میں میں روبینہ جی کے ایک خواب کی عکس بندی کرنا چاہتی ہوں اور اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ یہ خواب جلد از جلد شرمندہ تعبیر ہو۔اس نظم کا نام ہے'' ہے یہ تیری تقدیر''۔

اے وادیٔ کشمیر\
نئی صبح ہوگی۔۔نیا سورج نکلے گا\
تمہاری کوکھ سے پھوٹنے والے۔۔۔گل بوٹے\
تمہارے یہ بچے۔۔\
تمہارا حسن۔۔۔تمہاری خوبصورتی۔۔\
تمہیں واپس لوٹائیں گے۔۔۔\
پھر وہی دن آئیں گے۔۔۔\
چاند نکلے گا۔۔تارے جگمگائیں گے\
تمہارے پھولوں کی مہک۔۔۔\
تمہارے باغوں کی دلکشی۔۔\
تمہارے آبشاروں کی بجتی بانسری۔۔۔\
دنیا کو کھینچ کر۔۔۔تمہارے قدموں میں لائے گی\
اور تو پھر وہی ''جنت کشمیر'' کہلائے گی۔

☆☆☆

Rubeena Mir ki Shairi mein nisaai hissiyat by Mohd. Shabir
(Research Scholar,deptt.of Urdu MANUU, Hyedrabad)
محمد شبیر(ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو، مانو، حیدرآباد)

روبینہ میر کی شاعری میں نسائی حسیت

روبینہ میر عہد حاضر کی ممتاز اور معتبر شاعرہ ہیں۔روبینہ میر کا تعلق جموں و کشمیر کے خطہ پیر پنجال سے ہے۔ پیشے سے روبینہ میر ایک معلمہ کے طور پر اپنی خدمات دے رہی ہیں۔شعر و ادب میں کافی دلچسپی رکھتی ہیں۔روبینہ میر عہد حاضر کی ایسی شاعرہ ہیں جو اردو شعر و ادب میں اپنا مقام اور تشخص منوانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔انھوں نے شعر و شاعری کا آغاز ذرا تاخیر سے کیا۔لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔روبینہ میر خطہ پیر پنجال کی شاعری کے افق پر ایک ابھرتا ہوا ستارہ ہیں۔انھوں نے اردو شاعری میں غزل اور نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔دونوں صنفوں میں کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ان کے چار شعری مجموعے تفسیر حیات(۲۰۱۲)،آئینہ خیال(۲۰۱۳)،حرف زار(۲۰۱۷) اور اضطراب(۲۰۲۱) شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتی ہیں اور محسوس کرتی ہیں، اسے شعری قالب میں ڈھال دیتی ہیں۔ان کی شاعری کا ارتقائی سفر ابھی جاری ہے۔روبینہ میر کی شاعری میں موضوعاتی تنوع اور وسعت پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں مختلف سماجی ،سیاسی اور اقتصادی مسائل کو موضوع سخن بنایا ہے۔روبینہ میر ایک حساس شاعرہ ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کے جذبات، احساسات، خواہشات،نظریات اور دلی کیفیات کو موضوع سخن بنایا ہے۔انھوں نے غزلیہ شاعری اور نظمیہ شاعری دونوں میں عورت کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کی ہے۔معاشرے میں عورت کو ثانوی درجے کی سمجھا جاتا ہے۔بیٹے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں جب کہ بیٹی کی پیدائش کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے جبکہ بیٹے کے مقابلے بیٹی کی تعلیم و تربیت پر اتنی خاص توجہ نہیں دی جاتی ہے۔تعجب ہے کہ آج بھی بہت سے خانوادوں میں شوہر اور سسرال والے بہو بیٹیوں کو اس بات پر مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ بیٹیاں پیدا کرتی ہیں۔روبینہ میر نے ایسی منفی سوچ رکھنے والوں کو بیٹی کی اہمیت اور افادیت کا احساس دلایا ہے۔اس ضمن میں ان کی ایک مسلسل غزل سے چند اشعار

ملاحظہ ہو۔

کیسے بتاؤں تم کو کیا ہوتی ہیں بیٹیاں ہیرے اگر ہیں بیٹے تو موتی ہیں بیٹیاں
ماں، باپ دل شکستہ ہوں تو روتی ہیں بیٹیاں چین و سکون دِل کا یہ کھوتی ہیں بیٹیاں
ماں باپ کو ذرا سی بھی ہو تکلیف اگر ایسے میں رات بھر کہاں سوتی ہیں بیٹیاں
نازک مزاج ہونے کے باوجود بھی یہ دودو گھروں کا بار ڈھوتی ہیں بیٹیاں

(حرف زار، ص ۴۳)

قبل از اسلام لوگ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ظلمت اور جہالت عروج پر تھی۔انسانی معاشرے میں مختلف قسم کی برائیاں اور رسومات پائی جاتی تھیں۔ایسی ہی جاہلانہ رسومات میں سے ایک رسم بعض قبیلوں میں بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی بھی تھی۔ظہور اسلام سے اس رسم سے لڑکیوں کو ضرور راحت ملی۔لیکن موجودہ دور میں بھی دختر کشی کا کوئی نہ کوئی معاملہ سامنے آتا رہتا ہے۔بعض قبیلوں اور خاندانوں میں آج بھی لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔قبل از پیدائش مادر رحم میں ٹیکنالوجی کے ذریعے بچے کی تشخیص کی جاتی ہے۔لڑکی معلوم ہونے پر ٹیکنالوجی اور ادویات کو استعمال میں لاکر مادر رحم میں ہی بچیوں کو قتل کیا جاتا ہے۔یہ بری رسم اسی زمانہ جاہلیت کی یاد دلاتی ہے۔جس دور میں لڑکیوں کو زندہ دفنایا جاتا تھا۔لڑکیوں کی پیدائش کا اوسط دن بہ دن کم ہوتا جارہا ہے۔معاشرے میں بعض خاندان چاہے تعلیم یافتہ ہوں یا غیر تعلیم یافتہ ،لڑکیوں کو بوجھ سمجھ کر مادر رحم میں قتل کردیتے ہیں۔دور جہالت کے مقابلے موجودہ دور میں تھوڑی تبدیلی ضرور آئی ہے۔اُس زمانے میں لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا لیکن موجودہ دور میں پیدائش سے قبل ہی قتل کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں روبینہ میر کی نظم ''وطن کی بیٹیوں کے نام'' کا ایک بند دیکھیے۔

اے میرے وطن کی بیٹیو نہ کسی پہ ہرگز یقین کرو
کبھی گاڑ دیتے تھے ریت میں آج مار دیتے ہیں پیٹ میں
کوئی مار کے ڈال دے گیٹ میں کوئی پھینک دے تمہیں کھیت میں

(آئینہ خیال، وطن کی بیٹیوں کے نام، ص ۲۶۸)

عورت سماج ،قوم،قبیلہ اور خاندان کا اہم حصہ ہے۔ملک،قوم، معاشرے اور خانوادے کی ترقی اور فلاح بہبودی میں عورت برابر کی شریک ہے۔سوائے عورت کے کائنات کی کوئی رونق نہیں ہے۔عورت کے بغیر دنیا نامکمل اور ادھوری ہے۔ایک عورت کے کئی رشتے ہوتے ہیں مثلاً

ماں، بہن، بیٹی، بہو، بیوی، ساس وغیرہ۔ دختر کشی سے صرف ایک لڑکی کا قتل نہیں ہوتا بلکہ کئی رشتوں کا قتل ہوتا ہے۔ اس بات کا احساس روبینہ میر نے اپنی نظم ''حوا کی بیٹی'' میں دلایا ہے ؎

''کیا تم نہیں جانتے؟
کہ میرے بغیر
یہ دنیا نامکمل ہے
میرے بغیر ۔۔۔
یہ دنیا بے رنگ ہے
میں صرف لڑکی ہی نہیں ہوں
بلکہ ۔۔۔
ماں بھی ہوں ۔۔۔
بیوی بھی ہوں ۔۔۔
بہن بھی ہوں ۔۔۔
ایک لڑکی کو مار کر
تم کتنے رشتے مارو گئے؟''

(آئینہ خیال، حوا کی بیٹی، ص ۳۶۶)

روبینہ میر کی شاعری میں عورت کے جذبات کی شدت ہے۔ انھوں نے خلوص اور سچائی کے ساتھ عورت کے جذبات اور احساسات کو اپنے شعری تخیل میں پیوست کیا ہے۔ دختر کشی کے مسئلے کی وجہ سے روبینہ میر کافی رنجیدہ اور غمزدہ ہیں۔ ایک لڑکی جس نے ابھی آنکھیں کھولی نہیں، دنیا کو دیکھا نہیں اور موت اس کا نصیب بن جاتا ہے۔ بالآخر انسان کیوں بے قصور اور معصوم بچیوں کا قتل کر دیتا ہے۔ ان جذبات کا اظہار روبینہ میر نے اپنی نظم ''میرا قصور'' میں کیا ہے ؎

''میں وہ مظلوم ہوں
جو مسلسل چیخے جا رہی ہوں
مگر!
کسی کے کانوں تک میری آواز نہیں پہنچتی
میں وہ کلی ہوں

جسے کھلنے سے پہلے مسل دیا گیا ہے
میں وہ معصوم جان ہوں
جس کے لئے ماں کی کوکھ قتل گاہ ہے
میں وہ بدنصیب ہوں
جسے آنکھ کھولنے سے پہلے ہی
کوڑے دان کی نذر کیا جاتا ہے
آخر میری خطا کیا ہے؟
مجھے انصاف دو
میں
ایک لڑکی ہوں۔۔!!
یہی میرا قصور ہے

(آئینہ خیال، میرا قصور، ص ۳۶۹)

روبینہ میر نے عورت کی بے بسی، مجبوری، مظلومیت، مرد اساس معاشرے کی محکومیت اور درد و کرب کی موثر ترجمانی کی ہے۔عورت کے وجود، مقام و مرتبہ کا احساس دلایا ہے۔ پدری اساس معاشرے کو للکارتے ہوئے عورت کے وجود، حیثیت، مقام اور مرتبہ سے آشنا کروایا ہے۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

زباں رکھتی ہوں میں بھی منہ میں اپنے اے جہاں والو
مجھے کمزور مت سمجھو کسی صورت جہاں والو
کبھی تُو کر نہیں سکتا مجھے جو کام بخشا ہے
مجھے انسان کی تخلیق کا انعام بخشا ہے
حقیقت ہے مرے ان قدموں کے نیچے ہی جنت ہے
اسی جنت کی گہرائی میں دنیا بھر کی راحت ہے
بطن سے میرے تو پھوٹا ہے خود پر ناز کرتا ہے
میرے ہی سامنے چلاتا ہے آواز کرتا ہے
جہاں والوں نے ہر پل امتحاں میں مجھ کو ڈالا ہے

ہزاروں مشکلیں سہہ کر بھی میں نے تجھ کو پالا ہے
جہاں میں میرے ہی دم سےتو ترا بول بالا ہے
تیری اس بے حسی نے مجھ کو اب حیرت میں ڈالا ہے

ہمارے سماج میں عورت کو غلام تصور کیا جاتا ہے۔مرد اپنے آپ کو حاکم تصور کرتے ہیں،عورت کو محکوم بنایا جاتا ہے۔مرد اپنی مردانگی دکھانے کے لئے عورت پر حکم چلاتا ہے۔عورت کو حکم ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔مرد جس طرح چاہے اس طرح کا عورت کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔عورت کو مرد کے ہر حکم کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔جس طرح مرد کہے گا اسی طرح عورت کو ماننا پڑے گا۔بعض مرد عورت کو طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔طلاق کی دھمکی کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔عورت طلاق ہونے کے خوف سے مجبوراً مرد کے ہر حکم کو ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔عورت کو ہمیشہ یہ ڈرستا تا رہتا ہے کہ کہیں مجھے طلاق نہ مل جائے۔عورت کے ان جذبات اور احساسات کی عکاسی روبینہؔ میر کی نظم ''طلاق''میں ملتی ہے۔

''تمھیں وہی کرنا ہے۔
جو میں کہوں گا۔۔
جو میں چاہوں گا۔۔
چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔۔۔
ہاں۔۔۔
چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔۔۔
مگر میں تمہاری بیوی ہوں۔۔۔
بیوی۔۔۔!
رکھیل نہیں۔۔۔
تبھی تو کہہ رہا ہوں
''تم میری بیوی ہو''
جو ہتھیار میرے پاس
تمہارے لئے ہے
وہ کسی رکھیل کے لئے نہیں

کیونکہ وہ آزاد ہے
اپنی مرضی سے آجا سکتی ہے
مگر تم۔۔۔
میری مرضی کے بغیر
کچھ نہیں کر سکتی
ورنہ جانتی ہو۔۔۔
میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔؟
مجھے اختیار ہے
کہ جب چاہوں
تمہیں اپنے گھر سے کر سکتا ہوں بے گھر
صرف اتنا کہہ کر
طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔
مگر
یہ بچے
یہ گھر بنانے میں
میں نے جو خون پسینہ ایک کیا
وہ۔۔
سب کس لئے۔۔؟
اگر تم اتنی آسانی سے
لفظ طلاق اپنا سمجھ کر
جب چاہو۔۔۔
کر سکتے ہو استعمال
افسوس۔۔۔! مجھے زندگی بھر
مر مر کر جینا ہے
اس لفظ کے ڈر سے

یہ لفظ ہر روز
مجھے نئی موت مارتا ہے
نہ جانے کب
کہاں۔۔۔؟
تم مجھ سے کہہ دو
طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔طلاق۔۔۔''

(حرف زار، طلاق، ص ۱۰۸)

ایک عورت کی جب طلاق ہوتی ہے، اس کے دل پر کیا گزرتی ہے یہ وہی طلاق شدہ عورت بہتر جانتی ہے۔ روبینہ میر کو طلاق شدہ عورت کے درد و کرب کا احساس ہے۔ طلاق شدہ عورت کے جذبات اور احساسات کی بہترین عکاسی روبینہ میر نے اپنی نظم ''کل بھی تھی بے گھر، آج بھی ہے بے گھر'' میں کی ہے ۔

کتنی بے رحمی سے نکال دیا جاتا ہے تجھے
یہ کہہ کر طلاق، طلاق، طلاق۔۔۔!
تیرے جسم کے اعضاء یعنی تیرے بچے
تجھ سے چھین لیے جاتے ہیں
تیرے ہاتھوں سے بنی کسی چیز پہ تیرا حق نہیں رہتا
تجھ سے وہ حق لئے جاتے ہیں
جو مالک بحر و بر نے تجھے عطا کئے ہیں
کب تک تو اس ظلم کی شکار رہے گی۔۔۔!
کس سے کرے گی۔۔۔؟
اپنی مظلومیت کی شکایت
اس گونگے بہرے۔۔۔سماج میں
کوئی تیری فریاد سننے کو تیار نہیں

(تفسیر حیات، کل بھی تھی بے گھر، آج بھی ہے بے گھر، ص ۲۰۳)

مرد شادی کرنے کے بعد عورت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات نقش ہو

جاتی ہے کوعورت جو میرے نکاح میں آئی ہے یہ ہر زاویے سے میری محکوم ہے اور میں اس کا حاکم ہوں۔وہ جس طرح چاہے عورت کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔بعض اوقات مرد عورت کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا ہے ۔

عورت کو سمجھو نہ جاگیر اپنی — نہ یہ خواب اپنا نہ تعبیر اپنی
کرے دفن خواہش کا اپنے ہی ہاتھوں — مسخ کیوں کرے گی یہ تصویر اپنی
اگر یوں ہی چلتا رہا سلسلہ تو — یقیناً یہ توڑے گی زنجیر اپنی

(آئینہ خیال،عورت،ص ۲۸۰)

روبینہ میر کی شاعری میں عورت کی زندگی کے کئی مسائل اور رخ موجود ہیں۔روبینہ میر عورت کی بھر پور نمائندگی اور وکالت کرتی ہیں۔انھیں عورت کی اہمیت وافادیت،مقام ومرتبہ اور عظمت کا احساس ہے کیوں کہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں،سیاستدانوں،سائنسدانوں، دانشوروں،محققوں،حکیموں،عالموں،فنکاروں،فلسفیوں اور عظیم ہستیوں کو عورت نے جنم دیا ہے اور عورت ہی کے بطن سے انبیاء اکرام اور اولیاء اکرام پیدا ہوئے ہیں۔روبینہ میر نے عورت کے مقام،مرتبہ،حیثیت،عظمت اور اہمیت کا احساس دلایا ہے۔

ہے وجود زن سے قائم زندگی کا آشیاں — اور زندہ اس کلی سے ہے بہار گلستاں
ہیں زمین زن سے پھوٹے خوب روسروسمن — انبیاءواولیاءسب اس زمیں کے ہیں چمن

روبینہ میر کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے پاس ذخیرہ الفاظ وسیع ہے۔الفاظ کا برمحل اور بموقع استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔علاوہ ازیں ان کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ان کی شاعری کا یہ وصف ہے کہ انہوں نے سادہ،سلیس اور عام فہم الفاظ میں بلند تخیل پیش کیا ہے۔پیچیدہ الفاظ اور اصطلاحات سے گریز کیا ہے۔سیاسی،سماجی اور اقتصادی مسائل کے علاوہ خواتین کے مسائل ان کی شاعری کا مرکز اور محور ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کی بے بسی،مرد غالب معاشرے کا دباؤ،عورت کی محکومیت اور جنسی استحصال جیسے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔علاوہ ازیں عورت کی اہمیت وافادیت،مقام ومرتبہ اور قدر ومنزلت سے مرد اساس معاشرے کو روشناس کروایا ہے۔روبینہ میر نے جموں وکشمیر کی خواتین اردو شاعری کے باب میں نسوانی جذبات اور احساسات میں اضافہ کیا ہے۔صنف نازک کا دردان کے قلب میں رچا بسا ہوا ہے۔

☆☆☆

منتخب نظمیں Muntakhab Nazmein

روبینہ میر Rubina Mir

اے اللہ Aye Allah

تو ہی ہے
جو مجھ سے ۔۔۔۔ بے پناہ پیار کرتا ہے
باوجود
میری خطاؤں کے
تو ہی ہے
جو پردہ ڈالتا ہے
میرے عیبوں پر
باوجود اس کے
کہ تو سب دیکھتا اور سنتا ہے
تو ہی ہے
جو کبھی جتاتا نہیں احسان
باوجود ان گنت نعمتیں
عطا کر کے
تو ہی ہے
جو مجھ کو روزی دیتا ہے
باوجود میری ناشکری کے
تو ہی ہے
جو بدلتا ہے
خوشی میں میرے ہر غم کو
باوجود یہ جاننے کے
کہ تیری رحمت سے
ناامید ہو چکی ہوں
تو ہی ہے
جو مجھے جینے کا حوصلہ دیتا ہے
اس وقت
جب زندگی مجھ سے
جینے کے راستے چھین رہی ہوتی ہے
تو ہی ہے
جو درگزر کرتا ہے
میری ہر خطا کو
باوجود اس کے
کہ تو سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے
تو ہی ہے
اے اللہ
تو ہی ہے

☆☆☆

نعتِ پاک Naat-e-Paak

میرے دل کی ہر خوشی ہے آپ ﷺ سے
یعنی میری زندگی ہے آپ ﷺ سے

جس سے مجھ پر منکشف ہر راز ہے
مجھ کو حاصل آگہی ہے آپ ﷺ سے

میرے دل سے دور ہیں رنج و الم
میرے ہونٹوں پر ہنسی ہے آپ ﷺ سے

میرے لب پر تذکرہ ہے آپ ﷺ کا
لو فقط آقا لگی ہے آپ ﷺ سے

میری نظروں میں عیاں ہر چیز ہے
دور تک اک روشنی ہے آپ ﷺ سے

☆☆☆

کبھی تم دیر مت کرنا

میں روٹھوں تو منانے میں
مجھے واپس بلانے میں
چراغ دل جلانے میں
اندھیروں کو مٹانے میں
دیار دل بسانے میں
کہ میرے پاس آنے میں
کبھی تم دیر مت کرنا

یقیں کی داستاں تم ہو
کہ مثل کہکشاں تم ہو
میں دل ہوں تو زباں تم ہو
مرے اندر نہاں تم ہو
کہ میرے رازداں تم ہو
مگر اندھیر مت کرنا
کبھی تم دیر مت کرنا

مری قسمت تمہیں تو ہو
مری الفت تمہیں تو ہو
مری چاہت تمہیں تو ہو
مری عزت تمہیں تو ہو
مجھے تم زیر مت کرنا
کبی تم دیر مت کرنا

محبت کے گلستاں میں
کہ اس شہر نگاراں میں
سجے دل کے شبستاں میں
خزاں میں اور بہاراں میں
کہ کوئے عہدو پیاں میں
محبت کے یہ میداں میں
مجھے تم ڈھیر مت کرنا
کبھی تم دیر مت کرنا
کبھی تم دیر مت کرنا

☆☆☆

سیاست

کیا سے کیا نہیں ہوتا؟
اس کے اک اشارے پر
جھوٹ،فریب،مکاری،بے ایمانی،رشوت ستانی
یہ سب (عوامل) تو اس کے زر خرید غلام ہیں
جو ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑے ہیں
اس کے حکم کے تابع
یہ نقاب پوش
شعبدہ باز حسین دوشیزہ
کیا کیا گل کھلاتی ہے
پردے کے پیچھے رہ کر
کتنے سہاگ اجاڑ دیتی ہے
کتنی ماؤں سے
ان کے سہارے چھین لیتی ہے
کتنے معصوموں کو یتیم کرتی ہے
یہ سب اس کے بائیں ہاتھ کے کھیل ہیں
سیاست بازوں کے گھر کی لونڈی
سیاسی بازی گروں کو
اس قدر عزیز ہے
جس قدر" مرنے والے کو زندگی"
شعبدہ بازیوں،عشوہ طرازیوں سے
اچھے خاصے دانا کو
اپنے جال میں پھنسا کر
اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے
اس نے۔۔۔وہ سب۔۔
پہلے سے طے کر رکھا ہوتا ہے
کہ کب۔۔کہاں۔۔؟اور کیسے۔۔؟
کیا کرنا ہے۔۔۔؟
یہ کھلاڑی۔۔کئی کھیل۔۔۔
بنا مقابلے کے جیت جاتی ہے
اور جہاں مقابلہ کڑا ہو
وہاں یہ موت کا کھیل کھیلتی ہے
کئی بے گناہوں کو
موت کی ابدی نیند سلا کر
خود کو/مکھن سے بال کی طرح/باہر نکال دیتی ہے
اس شعبدہ باز/حسین دوشیزہ کا دوسرا نام
"سیاست" ☆☆☆

کڑوا سچ

بنتِ حوا کی کہانی
قلم کی زبانی
یاد ہے۔۔۔!
آج بھی مجھے
وہ سب
اپنے بیگانوں سے
اعتبار کھو جانے کے بعد
شام کے دھندلکے میں
تن، تنہا
جب میں گھر سے نکلی تھی
وہ
رات کا سناٹا!
گھپ اندھیرا!
میں اور میری تنہائی
بے منزل راہ کی جانب سفر
دردناک موت کو دعوت دینے کے سوا!
کچھ نہ تھا
راستے میں قدم قدم پر
آدم زاد بھیڑیوں سے
میرا سامنا ہوتا رہا!
جو چہرے بدل بدل کر آتے!!
مجھے ڈراتے

اکیلا دیکھ کر
فایدہ اٹھانا چاہتے تھے
میری تنہائی کا
میرے عورت ہونے کا!!
شاید؟
وہ جان چکے تھے
کہ بنتِ حوا کا دوسرا نام
بے بسی ہے! مجبوری ہے! لاچاری ہے!!
حوا کی بیٹی کے جسم کے متلاشی (حرام خور)
آدم زاد بھیڑیے!!
نوچ نوچ کر کھانا چاہتے تھے
میرے وجود کو!!
میرے روبرو آنے پر
ہوس بھری نظروں سے!
میری جانب تکتے
جملے کستے! مجھ پر ہنستے!!
نظروں سے ڈستے!!
پیٹھ پر وار کرتے
پیار کے نام پر
شکار کرنے والے شکاری
میری ذرا سی غفلت کے منتظر!!
مجھے ادھورا ہونے کا احساس دلا کر
پورا کرنے کے خواب دکھانے والے
شاید یہ نہ جانتے تھے

کہ اس کہانی کا اصلی کردار
"میں ہی ہوں"
اگر میں ہی اس کہانی سے نکل جاتی ہوں
تو یہ کہانی
ہمیشہ کے لئے ادھوری رہ جائے گی!!
ایسے میں
رک جاتی میں کچھ دیر کے لئے
بیٹھ جاتی
کسی تناور درخت کے پیچھے
جب ساری دنیا سو جاتی!!
تو میں اپنے پیروں میں سفر باندھ لیتی
آہستہ آہستہ
خالق کائنات کی ہر چیز
میرے ساتھ چلنے لگی
میری ہم سفر بن کر
میری تنہائی کو ہوئی شناسائی
ہر شئے سے
ہر چیز اپنا حال بیان کرنے لگی
خاموشی سے
تقاضا کرنے لگی مجھ سے
کہ ہمیں جانو۔۔ہمیں پہچانو
ہم بھی تمہاری طرح
سب کچھ دیکھ رہے ہیں!
مگر بول نہیں سکتے

ہم بھی تمہاری طرح ہیں
بے بس۔۔لاچار
تم ہماری زبان بن جاؤ
تم ہمارا احساس بن جاؤ
تم ہم میں سما کر
ہمارا درد محسوس کرو
ہم تمہاری طاقت بن جائیں گے
سو اب میں تنہا نہیں ہوں
بلکہ خالق کائنات کی ہر شے
میری غزلوں میں، میری نظموں میں
شامل ہو کر
میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے
میری رفیق بن کر
میری دوست بن کر
اب میں تنہا نہیں ہوں
بلکہ اب ہے میرے ساتھ
ساری کائنات

☆☆☆

نیلام گھر

یہاں میں
اس نیلام گھر کی بات نہیں کرتی
جہاں
پرانی اور بوسیدہ چیزوں کو
کچھ کوڑیوں کے عوض میں
بیچا یا خریدا جاتا ہے
بلکہ
یہاں میری مراد اس نیلام گھر سے ہے
جہاں حاکم وقت
عدالتوں سے
عدل وانصاف خریدتے اور بیچتے ہوں
جہاں غریبوں کی چھوٹی خوشیوں کو
شہر کے امراء
اپنی مرضی کے مطابق
من پسند قیمت سے خرید اور بیچ سکتے ہیں
جہاں غریب کے حق کی بولی لگتی ہے
اور منہ مانگی رقم کے عوض
غریب کا حق خریدا یا بیچا جا سکتا ہے

☆☆☆

سیلفی غریب زادوں کی

اگر ہمارے پاس
اسمارٹ فون نہیں
تو نہ سہی۔۔ارمان تو ہیں
مچلتے جذبات تو ہیں
آؤ۔۔سبھی۔۔بھوکے ننگے غریب زادوں!!
غریب ماں باپ کے شہزادوں
سیلفی لیتے ہیں
مسکراؤ۔۔۔کھل کر مسکراؤ
کسی کے باپ کی میراث نہیں ہیں خوشیاں
جو ہم حاصل نہیں کر سکتے۔۔۔ہماری دنیا تو
انہیں چھوتی چھوٹی خوشیوں سے آباد ہے
ادھر دیکھو
کوئی بھی آنکھ نہ جھپکنا
قید ہو رہی ہے
کیمرے میں
ہماری برہنہ حسرت
کلک!!!

☆☆☆

عاصفہ

نازک سی گڑیا
آٹھ سالہ "عاصفہ"
ہاتھ میں گڑیا تھامے
چلی تھی چراگاہ میں
بھیڑ بکریوں کو چرانے
پنگھٹ سے پانی پلانے
کسے پتہ تھا؟
کہ آموں کے جھرمٹ سے
نکلیں گے۔۔۔آوارہ بیل!!
ہوس کی لال زبان نکالے
نوچ نوچ کر گوشت کھانے۔۔۔کے بعد
ڈکرائیں گے۔۔۔کھروں کو کھرچتے ہوئے
آٹھ سالہ عاصفہ کے وجود کو
نگلنے کی کوشش کریں گے۔۔۔لیکن
عاصفہ کی گڑیا۔۔۔گئی اٹک ان کے حلق میں
اب وہ لیتے ہیں
سانس مگر آہستہ آہستہ

☆☆☆

ایک سچی نظم

میں اکثر
تصوراتی دنیا سے نکل کر
سنی سنائی باتوں پر
یقین کرنے کے بجائے
جان وشان کی پرواہ کئے بغیر
خطرہ مول لے کر
تلخ حالات سے گزرتی ہوں
کبھی آگ سے کھیل کر
کبھی کانٹوں پر چل کر
کبھی کانچ کے ٹکڑے چبا کر
کبھی شدت غم سہہ کر
کبھی عجب بے قراری سے گزر کر
تجربات حاصل کرتی ہوں
تاکہ
درد کی شدت
محسوس کرنے کے بعد
میرے احساس کی کوکھ سے
لے سکے جنم
"ایک سچی نظم"

☆☆☆

وہ آئے گا

ہر دستک پہ چونک جاتی ہے
ہر آہٹ پہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے
کئی سالوں سے۔۔ ہر عید پر
مجھ سے یہی کہتی ہے۔۔۔
کہ وہ آئے گا۔۔ضرور آئے گا
عید کے دن
یہ میں نہیں۔۔۔ بلکہ میری ممتا ہے
جو مجھے یقین دلاتی ہے
جو مجھے جھوٹی تسلی دیتی ہے
جو مجھے نا امید نہیں ہونے دیتی
یہ کہہ کر۔۔کہ وہ آئے گا۔۔ضرور آئے گا
عید کے دن
یہ میں نہیں۔۔ بلکہ میری ممتا کی
پاک اور سچی محبت ہے
جو اولڈ ایج ہوم میں
کسمپرسی کی زندگی
گزارنے کے باوجود
بیٹے کی راہ دیکھتے
مجھ سے کہتی ہے
کہ وہ آئے گا۔۔۔ضرور آئے گا

☆☆☆

بوڑھی نہیں ہوتی

تم کبھی
بوڑھی نہیں ہو سکتی
اور نہ بڑھتی عمر
تمہاری خوبصورتی کو متاثر کر سکتی ہے
تم کمزور ہو سکتی ہو۔۔۔مگر بوڑھی نہیں
یہ چہرے کی جھریاں تمہیں
بدصورت نہیں کر سکتیں
جھکی کمر
تمہارے احساس پر حاوی نہیں ہو سکتی
تمہارا سچا اور پاکیزہ جذبہ ہی
تمہاری خوبصورتی ہے
تمہارے حسن کی علامت ہے
تمہاری طاقت ہے
میں نے جب جب
تمہارے احساس کو
قریب سے۔۔چھو کر دیکھا
تو میں نے یہی پایا
کہ سچے اور پاکیزہ جذبے کا
دوسرا نام محبت ہے
محبت کبھی۔۔۔بوڑھی نہیں ہوتی

☆☆☆

منتخب غزلیں Muntakhab Ghazlein

روبینہ میرؔ

دل میں یہ احساس ہے میرے مگر
کچھ نہ کچھ تو پاس ہے میرے مگر
اب کسی شے کی ضرورت ہی نہیں
جب سے حزن و یاس ہے میرے مگر
اس کی خاطر جینا چاہوں گی ضرور
دل میں جس کی آس ہے میرے مگر
من کی دولت مل نہیں پائی کبھی
تن کی دولت پاس ہے میرے مگر
جی میں جو آتا ہے روبینہؔ کرو
اب نہیں وہ پاس ہے میرے مگر

(2)

نہ مجھ کو آگ میں جلنا نہ اب پانی میں رہنا ہے
مجھے تو اب اندھیروں کی نگہبانی میں رہنا ہے
نہ پیدا ہوگی دل کے گلستاں میں آرزو کوئی
مجھے معلوم ہے تا عمر ویرانی میں رہنا ہے
میں ہرگز اس زمانے سے نہ کوئی واسطہ رکھتی
اگر معلوم ہوتا کہ پریشانی میں رہنا ہے
جو طوفانوں کے ہیں آداب مجھ کو سیکھنے ہوں گے
سفینے کی طرح مجھ کو بھی طغیانی میں رہنا ہے
نبھائیں ہیں زمانے سے وفائیں میں نے یوں اکثر
مجھے اپنی خطاؤں پر پشیمانی میں رہنا ہے
روبینہؔ نا خدا کی ہو نہیں سکتی ضرورت پھر
سفینے کو اگر دریا کی طغیانی میں رہنا ہے

(3)

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا
ہر طرف اک حشر برپا ہو گیا
آپ جب سے ہو گئے ہیں بے نیاز
گلستانِ دل بھی صحرا ہو گیا
تیری باتیں کس قدر تھیں پر فریب
میں یہ سمجھی تھی تو میرا ہو گیا
مائل تحقیق جب بھی میں ہوئی
زندگی کا راز گہرا ہو گیا
سادھ لی تم نے روبینہؔ خامشی
سب کی نظروں میں تماشہ ہو گیا

(4)

جب وہ ملے تنہائی میں
تھے غم کی گہرائی میں
دل یہ کھویا کھویا تھا
یادوں کی پروائی میں
ان سے بچھڑ کر ایسا لگا
جیسے گرے ہم کھائی میں
دنیا ڈوب گئی ان کی
آنکھوں کی گہرائی میں
نادانی میں لطف ہے جو
کہاں ہے وہ دانائی میں
روبینہؔ اکثر اپنی
عمر کٹی تنہائی میں

(5)

غم اس شدت سے ہیں ڈستے
رو پڑتی ہوں ہنستے ہنستے
آپ گئے کیا دل کی دنیا
اجڑ گئی ہے بستے بستے
دیرو حرم ہویا ویرانہ
اک منزل ہے کتنے رستے
روبینہؔ انہیں بھولوں کیسے
جو تھے مجھ پر جملے کستے

(6)

ہر کوئی جینے سے ہے بیزار کیا ؟
زندگی ہے اک رہِ پر خار کیا ؟
سارے رہبر غازیء گفتار ہیں
ان میں ہوں گے صاحب کردار کیا ؟
کچھ بھی جب تکرار کا حاصل نہیں
ایسے میں دنیا سے ہو تکرار کیا ؟
زندگی میں ہر قدم آلام سے
ہم رہیں گے بر سرِ پیکار کیا ؟
جب نہیں کردار انساں کا کوئی
اس میں ہوگی خوبیء کردار کیا ؟
لازماً آنے کو ہے اک انقلاب
دہر میں ایسے ہیں کچھ آثار کیا ؟
سوچتے ہیں دل میں یہ روبینہؔ ہم
ہر کسی سے الجھیں ہم بے کار کیا ؟

(7)

حقیقت تھی وہ کوئی سپنا نہیں تھا
سراسر وہ میرا تھا، اپنا نہیں تھا
کہاں دل یہ شدت سے تڑپا نہیں تھا
کہاں وہ مجھے یاد آیا نہیں تھا
کئی راز تھے اس کے دل سے نمایاں
سمندر تھا لیکن وہ گہرا نہیں تھا
مرے گھر میں رونق کہاں اس قدر تھی
مرے گھر میں جب تک وہ آیا نہیں تھا
نہ کھل کر ہوئی تھی کوئی بات اس سے
کہ جب تک اسے میں نے دیکھا نہیں تھا
میں ہر بات کرتی تھی محتاط رہ کر
کسی پر بھی مجھ کو بھروسا نہیں تھا
کہاں جانتی اس کو دل کی یہ بستی
وہ میری گلی سے بھی گزرا نہیں تھا
اسے پوچھتا کون طوفاں کی باتیں
سفینہ جو ساحل پہ آیا نہیں تھا
وہ میرا ہے ،میرا رہے گا ہمیشہ
مجھے کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں تھا
اثر کر گیا اس کی باتوں کا جادو
جہاں میں وہ حسنِ سراپا نہیں تھا
ہر اک بات ہوتی رہی بے تکلف
کسی بات کا اس سے پردہ نہیں تھا

مرے راستے میں کئی مشکلیں تھیں
تعجب ہے دل میرا بکھرا نہیں تھا
میں اوروں کے بارے میں کیا رائے رکھتی
مجھے خود پہ بھی جب بھروسا نہیں تھا
میں کیسے اسے توڑ کر پھینک دیتی
وہ خط کوئی کاغذ کا ٹکڑا نہیں تھا
مٹاتا جو ہر اک خوشی میرے دل سے
محبت کا وہ رنگ پھیکا نہیں تھا
دیا جل رہا تھا سر راہ جو بھی
نشانہ مخالف ہوا کا نہیں تھا
ہوئی جو خطا تھی ، سراسر وہ میری
قصور اس میں کوئی بھی اس کا نہیں تھا
مری زندگی اک تذبذب میں گزری
کہ میں نے کہاں دھوکہ کھایا نہیں تھا
میں خیالوں میں گم ہو گئی تھی کہیں پر
مرا حال کچھ دن سے اچھا نہیں تھا
حقیقت ہے کچھ روز کے اس سفر میں
مرے ساتھ خود تھا ،وہ سایہ نہیں تھا
کہاں تھی مرے دل میں کچھ قدرو قیمت
کہ جب تک اسے میں نے کھویا نہیں تھا
خزاں کی تھی جب دسترس ہر کلی پر
چمن میں بہاروں کا کھٹکا نہیں تھا
وہ جس رنگ سے پیش آیا تھا مجھ سے
تقاضہ محبت کا ایسا نہیں تھا
مجھے علم کیسے یہ ہوتا وہ کیا ہے
اسے میں نے پہلے تو پرکھا نہیں تھا
روبینہؔ نہ تھا دونوں میں ربط کوئی
یہ دل غم سے جب تک شناسا نہیں تھا

(8)

وقت کو ہرگز نہ کھونا چاہیے
ڈھل چکی ہے رات سونا چاہیے
مدتوں تک غیر کے بن کے رہے
اب تو ہم کو اپنا ہونا چاہیے
رازِ دل جس پر میں سارے کھول دوں
یوں کوئی غمخوار ہونا چاہیے
نفرتیں کتنی بھلے درپیش ہوں
بیج الفت کا ہی بونا چاہیے
آنکھ سے آنسو اگر چہ نہ بہیں
دل پہ لازم ہے کہ رونا چاہیے
وہ سیاست داں ہیں ان کے واسطے
دل شکن ہرگز نہ ہونا چاہیے
رات کی جاگی ہوئی ہوں میر جی
اب مجھے لگتا ہے سونا چاہیے

(9)

میں یہاں رہوں یا وہاں رہوں
تمہیں کیا غرض میں کہاں رہوں
مری زندگی کی تھی آرزو
جہاں تو رہے میں وہاں رہوں
تو بھی بن کے طوفان آ کبھی
میں سفینہ بن کے رواں رہوں
جو سجی رہے تیرے ہونٹوں پر
کبھی بن کے وہ داستاں رہوں
کہیں گردِ رہ بن کے بکھروں میں
کہیں صورتِ کارواں رہوں
ترے گھر میں اتنے مکین ہیں
تو بتا میں آخر کہاں رہوں ؟
جو بھی دیکھوں کر دوں بیاں اسے
یہ غلط ہے میں بے زباں رہوں
میں بیاں ہوں روبینہؔ چہرے سے
ترے دل میں کب تک نہاں رہوں

(10)

رہ گئے گردِ رہ گزر بن کر
کیا ملا ان کے ہم سفر بن کر
کیا ہے دنیا یہ جان جائیں گے
آپ دیکھیں مری نظر بن کر
مانا ظلمت زدہ ہے روبینہؔ
پھر بھی ابھریں گے ہم سحر بن کر

(11)

ان کی باتوں میں اگر نہ آتے ہم
اس قدر دھوکے کبھی نہ کھاتے ہم
ہم کو لے ڈوبی ہماری سادگی
بے خطا ورنہ سزا پاتے نہ ہم
سر نگوں ہوتا نہ یہ طوفاں کبھی
یوں اگر طوفاں سے ٹکراتے نہ ہم
کیا خبر تھی ایک جیسے ہیں سبھی
شہر میں سب پر یقیں لاتے نہ ہم

(12)

یہ دریا کی موجیں یہ دریا کے دھارے
کہاں مل سکیں گے یہ رنگیں نظارے
وہ ہر حال میں ڈوب جائے گا اک دن
سفینہ ہے جو ناخدا کے سہارے
خبر یہ نہیں ہے کسی کو جہاں میں
تلاطم کی آغوش میں ہیں کنارے
ہے جن کو ملا اقتدار ان سے پوچھیں
کہاں جائیں جو ہیں مصیبت کے مارے
یقیناً بناتا ہے وہ بگڑی سب کی
اگر کوئی اس کو ہے دل سے پکارے
جو روبینہ گزرے ہیں لمحات غم کے
ہمیں جانتے ہیں وہ کیسے گزارے

(13)

جھیلنے ہیں دل پہ کچھ صدمات اور
بگڑے گی یہ صورت حالات اور
دور ہوگی اور نظروں سے سحر
ہے بکھرنے کو شبِ ظلمات اور
غم کے جو بادل ہیں چھٹنے کے نہیں
کھل کے برسے گی ابھی برسات اور
ان کے ہاتھوں میں ہے جب تک اقتدار
وہ بگاڑیں گے ابھی حالات اور
راہ حق میں مشکلیں ہیں ہر قدم
کیا چلیں گے آپ میرے ساتھ اور
کیا سمجھ میں آئے گی روبینہؔ یہ
معنی رکھتی ہے مری ہر بات اور

(14)

جدھر دیکھئے حشر سامانیاں ہیں
پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں
حقیقت میں ان کی مہربانیاں ہیں
مرے دل میں جتنی یہ حیرانیاں ہیں
گلستاں ہو یا ہو وہ صحرا نظر میں
بہت دور تک صرف ویرانیاں ہیں
مصائب سے ہر کوئی سینہ سپر ہے
میسر کہاں کس کو آسانیاں ہیں
خطا کار سارے مزے میں ہیں دیکھو
کہ ہر بے خطا پر نگہبانیاں ہیں
حقیقت میں وہ بے ارداہ تھیں ساری
ہوئی مجھ سے جتنی بھی نادانیاں ہیں
نہیں بخشتا ہے کسی ناؤ کو بھی
طلاطم کی ساری یہ من مانیاں ہیں
سمجھ لیتی ہوں ہر کسی کو میں اپنا
یقیناً مجھے یہ پشیمانیاں ہیں
جو میرا ہے میرا رہے گا ہمیشہ
خیال ایسے کیا میری نادانیاں ہیں؟
وہ مر کر بھی مرتے نہیں ہیں جہاں میں
وطن کے لئے جن کی قربانیاں ہیں
نہیں مجھ کو روبینہؔ کچھ چین حاصل
مرے رب کی مجھ پر مہربانیاں ہیں

(15)

کانچ کا تھا گھر بنایا پتھروں کے شہر میں
اس لئے وہ بچ نہ پایا پتھروں کے شہر میں
ہم کو جب چلنا نہ آیا پتھروں کے شہر میں
ہر قدم پر زخم کھایا پتھروں کے شہر میں
کون دیتا داد ہم کو کون تھا اہل نظر
ہم نے جب نغمہ سنایا پتھروں کے شہر میں
ماسوائے زخم گہرے کچھ مقدر میں نہ تھا
بس یہی کچھ ہم نے پایا پتھروں کے شہر میں
یہ حقیقت ہے روبینہؔ سخت تھا سب کا مزاج
جو بھی تھا اپنا پرایا پتھروں کے شہر میں

(16)

بات ظاہر ہے یہ زمانے پر
وہ ہیں مائل مجھے ستانے پر
اور اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں
برق گرتی ہے آشیانے پر
میں کہوں بھی تو کیا کہوں ان سے
یاد آئیں جو بھول جانے پر
قدر انسانیت کی ہوگی جب
میری نظریں ہیں اس زمانے پر
اور برہم ہوئی ہوں روبینہؔ
کب میں مانوں گی اب منانے پر

(17)

مصروف ہوں میں کب سے اسی انتظار میں
گلشن کو دیکھ پاتی میں رنگ بہار میں
سینچا ہے میں نے خون سے فصلِ بہار کو
امید ہے پھل آئیں گے فصلِ بہار میں
پابند تھے جو ہر طرح قول و قرار کے
وہ بات اب نہیں رہی قول و قرار میں
کیا لطفِ انتظار ہے ، یہ اس سے پوچھئے
گزری ہو جس کی زندگی ہی انتظار میں
جو لطف جیت میں ہے مبارک ہو وہ انہیں
کچھ اور ہی مزہ ہے، اس بازی کی ہار میں
روبینہؔ ان کو ڈھونڈنے جاؤں میں کس طرف
گم ہو گئی ہیں منزلیں گرد و غبار میں

(18)

کس طرح تم نے دبایا ہے مری آواز کو
جان لے گی ساری دنیاایک دن اس راز کو
گلستاں میں غنچہ و گل کو بکھرنا ہے ضرور
لازماً انجام تک جانا ہے ہر آغاز کو
کوئی نغمہ پیار کا اس سے نہیں جب پھوٹتا
کیا کروں اس حال میں دل کے شکستہ ساز کو
جانتی ہوں میں کہ وہ اس کا اڑائے گا مزاق
حال دل کا کیوں بتاؤں پھر کسی دم ساز کو
جب بھی میرے دل کے زخموں کو کبھی دیکھے گا وہ
کس قدر شرمندگی ہوگی زمانہ ساز کو

(19)

اس لئے نا قبول ہیں ہم لوگ
کچھ بھی ہو ، با اصول ہیں ہم لوگ
یاں قدرداں نہیں کوئی اپنا
آج کس کو قبول ہیں ہم لوگ
گلستاں میں نہیں کوئی وقعت
جیسے بے رنگ پھول ہیں ہم لوگ
ہم میں پنہاں ہے منزلِ مقصود
ویسے راہوں کی دھول ہیں ہم لوگ
جو نہ سمجھے ہیں اور نہ سمجھیں گے
خرد مندوں کی بھول ہیں ہم لوگ

☆☆☆

Ustad Shaheed Muthari ke Nuqt-e-Nazar se Ekhlaqi Falsafa by Hasnain Jassani (Research Scholar, Dept. of Persian, University of Mumbai)

حسنین جسانی (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی)

استاد شہید مطہری کے نقطہ نظر سے اخلاقی فلسفہ

آیت اللہ مرتضیٰ مطہری، جو ایران میں نئی اسلامی شعور کے بنیادی معماروں میں سے ایک تھے، ۲ فروری 1920 کو فریمان میں پیدا ہوئے، جو اُس وقت ایک گاؤں تھا اور اب مشہد کے قریب تقریباً ساٹھ کلومیٹر دور ایک قصبہ ہے۔ ان کے والد محمد حسین مطہری تھے، جو ایک معروف عالم تھے جنہوں نے نجف میں تعلیم حاصل کی اور کئی سال مصر اور حجاز میں گزارنے کے بعد فریمان واپس آ گئے۔ بزرگ مطہری اپنے بیٹے سے مختلف ذہن کے تھے، جو بہرحال اپنے والد سے زیادہ روشن خیال تھے۔ والد روایتی مولانا محمد باقر مجلسی کے کاموں کے مخلص تھے؛ جبکہ ماضی کے شیعہ علماء میں اس بیٹے کا عظیم ہیرو تھیوسوفسٹ ملا صدرا تھا۔ تاہم، آیت اللہ مطہری نے ہمیشہ اپنے والد کے لئے عظیم احترام اور محبت برقرار رکھی، جو ان کے پہلے استاد بھی تھے، اور انہوں نے اپنی سب سے مقبول کتاب، داستانِ راستان ('صالحین کی داستان')، جو پہلی بار ۱۹۶۰ میں شائع ہوئی تھی، اپنے والد کے نام وقف کی، اور بعد میں ۱۹۶۵ میں یونیسکو کی قومی کمیشن برائے ایران کی جانب سے سال کی کتاب قرار دی گئی۔ بارہ سال کی کم عمری میں، مطہری نے مشہد کے تعلیمی ادارے میں اپنی باقاعدہ مذہبی تعلیم شروع کی، جو اُس وقت زوال پذیر تھا، جزوی طور پر داخلی وجوہات کی بنا پر اور جزوی طور پر پہلا پہلوی آمر، رضا خان کی جانب سے اسلامی اداروں کے خلاف ریاستی دباؤ کی وجہ سے۔ لیکن مشہد میں، مطہری نے فلسفہ، الہیات اور عرفان کے لئے اپنی عظیم محبت دریافت کی، جو ان کی زندگی بھر کے ساتھ رہی اور ان کے مذہبی نظریات کو شکل دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

اخلاقی فلسفہ کا شعبہ، جو کہ اہم اور مقدر ساز علمی و فکری حوزہ ہے، عموماً قدیم زمانے سے، مفکرین اور فلاسفہ کے درمیان موضوع بحث رہا ہے۔ اخلاقی فلسفہ دو اہم شاخوں پر مشتمل ہے: ۱) معیاری اخلاق؛ ۲) بلند اخلاق۔ شہید مطہری ان دونوں حصوں میں ایک خاص اور مستقل رائے

رکھتے ہیں جسے دیگر اہم نظریات کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے؛ تاہم، اس بحث پر پہنچنے سے پہلے، علوم کے درمیان اخلاقی فلسفہ کی جگہ اور اس کے اہم موضوعات کی وضاحت کے لیے کچھ نکات کا ذکر ضروری ہے۔قدیم فلاسفہ عموماً حکمت یا فلسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے: نظری حکمت اور عملی حکمت ۔شہید مطہری نے نظری اور عملی حکمت کی تعریف یوں کی ہے:

" نظری حکمت کا مطلب ہے علم حاصل کرنا چیزوں کی حالتوں کے بارے میں جیسے کہ وہ چیزیں ہیں یا ہوں گی؛ جبکہ عملی حکمت کا مطلب ہے علم حاصل کرنا کہ انسانی اعمال کیسے اور کس طرح اچھے ہیں اور ہونے چاہئے اور کیسے اور کس طرح برے ہیں اور نہیں ہونا چاہئے۔مختصراً، نظری حکمت 'ہے' اور 'ہونا' کے بارے میں بات کرتی ہے جبکہ عملی حکمت 'چاہیے'، 'شاید' اور 'نہیں چاہیے' کے بارے میں بات کرتی ہے۔" (مطہری، ۱۳۷۹: صفحہ ۱۷۸)

نظری حکمت کو الہیات، ریاضیات، اور طبیعیات میں تقسیم کیا جاتا ہے جبکہ عملی حکمت کو اخلاق، گھر کی تدبیر، اور معاشرتی سیاست میں تقسیم کیا جاتا ہے؛ تاہم، آج کل جب اخلاق اور اخلاقی فلسفہ کی بات کی جاتی ہے تو یہ تمام عملی حکمت کے موضوعات کو شامل کرتا ہے۔اسی طرح، عملی حکمت، معروف معنی اور اصطلاح میں، اخلاقی فلسفہ کے معنی کا ایک حصہ بنتی ہے؛ کیونکہ معیاری اخلاق، عملی حکمت کے موضوعات میں سے ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے کہ عقلی تجزیہ کے ذریعے یہ واضح کیا جائے کہ کن معیاروں کے مطابق، ایک عمل 'اچھا' اور دوسرا عمل 'برا' بنتا ہے۔اخلاقی فلسفہ کا دوسرا حصہ بلند اخلاق ہے جو کہ معیاری اخلاق کے بارے میں ہے؛ یعنی اس حصے میں، اخلاقی مفاہیم اور تعبیرات جیسے کہ 'اچھا' اور 'برا' کا عقلی تجزیہ کیا جاتا ہے کہ آیا یہ مفاہیم حقیقی وجود رکھتے ہیں یا صرف مفروضہ مفاہیم ہیں وغیرہ۔شہید مطہری کے خیال میں، عملی حکمت کی خصوصیات جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱) یہ صرف انسان تک محدود ہے اور غیر انسانی دائرہ کو شامل نہیں کرتی۔ (ہم اچھائی اور برائی کے تصورات کو چیزوں پر بھی لاگو کرتے ہیں جو کہ اخلاق سے باہر ہیں)۔

۲) یہ انسان کے اختیاری افعال سے متعلق ہے اور اس کے غیر اختیاری افعال، جو کہ طب، فزیولوجی، اور نفسیات کے دائرے میں آتے ہیں، کو شامل نہیں کرتی۔

۳) یہ انسان کے اختیاری افعال سے متعلق ہے کہ ان کو کیسے ہونا چاہیے اور کیسے نہیں ہونا چاہیے، نہ کہ ان اعمال کی تمہیدات سے متعلق بحثیں جن کو انجام دینا چاہیے؛ اس وجہ سے اختیار کی ماہیت کے بارے میں بحثیں اور یہ کہ آیا انسان مجبور ہے یا مختار، عملی حکمت کے دائرہ سے باہر ہیں۔

۴)عملی حکمت سائنسی سطح پر تمام 'چاہیے' پر بحث نہیں کرتی؛ بلکہ ان 'چاہیے' پر بحث کرتی ہے جو کہ نوعی، کلی، مطلق، اور انسانی ہوتے ہیں، نہ کہ فردی اور نسبی 'چاہیے'؛ مثال کے طور پر یہ حکم کہ 'چاہیے کہ سچ بولا جائے' یا 'سچائی اچھی ہے' یا 'چاہیے کہ ظلم اور ظالم کے خلاف جدوجہد کی جائے'، تمام انسانوں کے لئے متعلق ہے، نہ کہ کچھ انسانوں کے لئے۔ (مطہری، ۱۳۷۹:صفحہ ۱۷۹)

لیکن یہ حکم کہ 'چاہیے کہ فارسی گرامر کی کتاب پڑھی جائے'، ان لوگوں کے لئے متعلق ہے جو فارسی زبان سیکھنا چاہتے ہیں، نہ کہ تمام انسانوں کے لئے۔ اگر ہم ایسے عام اور مطلق احکام کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، تو درحقیقت ہم عملی حکمت کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس قسم کے کلی اور مطلق انسانی احکام کے لوازمات یہ ہیں کہ اگر کوئی ان کا عمل کرے، تو وہ قابل تعریف، آفرین اور تحسین ہے۔ وہ شخص جو اپنی جان کو ظالموں کے خلاف جدوجہد میں قربان کر دیتا ہے، اس کا عمل قابل تعریف، آفرین اور تحسین ہے۔ (مطہری، ۱۳۷۵:ص ۱۳)

اب جبکہ کسی حد تک اخلاقی فلسفہ کی جگہ اور ماہیت اور اس کا عملی حکمت سے تعلق واضح ہو چکا ہے، ہم دوسرے موضوعات کی طرف رخ کریں گے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا تھا، آجکل اخلاقی فلسفہ کا مطالعہ اور جائزہ دو شعبوں، معیاری اخلاق اور بلند اخلاق، میں کیا جا رہا ہے۔ اب ہم شہید مطہری کی اس بارے میں رائے بیان کریں گے۔

۱) معیاری اخلاق: معیاری اخلاق کے متعلق نقطہ نظر عموماً دو بڑے گروہوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں:

۱) وجودی نظریات: اس نظریہ کے پیروکاروں کا ماننا ہے کہ کسی عمل کی اچھائی یا برائی، یا اس کی صحت یا غلطی، اس کے نتیجہ پر منحصر ہوتی ہے؛ تاہم عمل کے نتیجہ کے باب میں مختلف نقطہ نظر موجود ہیں۔ کچھ لوگ جیسے کہ آریستیپوس (۴۳۵ سے ۳۵۵ ق.م) اور اپیکیور (۴۲۲ سے ۳۰۷ ق.م) عمل کے نتیجے کو فاعل کے فائدہ یا لذت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی عمل فاعل کے لئے فائدہ مند یا لذت بخش ہو، تو وہ عمل اچھا ہے، ورنہ برا ہے۔ (کاپلسون، جلد ا، صفحہ ۴۶۷)

تنقید: اس نظریہ کی خامی یہ ہے کہ عمل کے نتیجے کو، عمل کی صحت یا غلطی کے تعین سے پہلے معلوم کرنا چاہیے، جو آسانی سے قابل تشخیص نہیں ہے؛ کیونکہ کچھ اعمال کے نتائج کے بارے میں فوری طور پر رائے قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ استاد شہید مطہری، اخلاقی مکاتب کو جو فردی یا اجتماعی لذت اور نفع پر مبنی ہوتے ہیں، اصولاً اخلاق نہیں سمجھتے: 1) وہ ایک عمل کو اخلاقی سمجھتے ہیں جو قابل ستائش، آفرین اور تحسین ہو اور وہ شخص جو فردی یا اجتماعی فائدے کے لئے کام کرتا ہے، ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ قابل

تحسین ہو۔ اسی طرح، خود پرستی کو مختلف قسم کے تجاوزات، ظلم اور اخلاقی برائیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔(مطہری، ۱۳۷۵: صفحہ ۱۲، ۲۸۰)

۲) دوسری خامی جو ان منفعت پر مبنی مکاتب کی طرف متوجہ ہوتی ہے، یہ ہے کہ وہ مادیت پرستانہ فلسفی نظام پر مبنی ہوتے ہیں؛ یعنی لذت اور نفع کو صرف مادی اور دنیاوی لذت اور نفع تک محدود سمجھتے ہیں۔ استاد شہید مطہری کے نظر میں، انسانی اخلاق اور شرافت، اور اخلاق، صرف خدا پرستی کے مکتب میں ہی جائز اور معتبر سمجھے جاسکتے ہیں۔(مطہری، ۱۳۷۵: صفحہ ۱۳۴)

استاد مطہری کا خیال ہے: اگر خدا اور ایمان نہ ہو، تو اخلاق ایسے کرنسی نوٹ کی طرح ہے جس کی کوئی پشت پناہی نہ ہو۔ شروع میں ممکن ہے کچھ لوگ سمجھ نہ پائیں؛ لیکن اس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہوتی۔ کیا فرانسیسی پہلے لوگ نہیں تھے جنہوں نے عالمی اعلامیہ حقوق انسانی کا اعلان کیا؟ لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ اعلامیہ کہاں گیا تھا؟ الجزائر کے واقعے میں کہاں تھا؟! کیا وہاں حقوق انسانی نہیں تھے؟! کیا یہ نہیں تھا کہ ایک قوم اپنا حق مانگ رہی تھی؟ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں تھی۔ اس وقت کیا کچھ نہیں ہوا! کیا انہوں نے عورتوں اور بچوں پر رحم کیا؟ تہذیب کے آثار پر رحم کیا؟ لائبریریوں پر رحم کیا؟ ثقافتی اداروں پر رحم کیا؟ عبادت گزاروں پر رحم کیا؟ (ہم خود اپنے زمانے میں دیکھتے ہیں) کیوں نہیں؟ کیونکہ بنیاد نہیں تھی۔(مطہری، ۱۳۷۵: ص ۲۸۶)

لہٰذا، جو شخص خدا، نفس کی جاودانگی، زندگی بعد از موت، اور الٰہی انبیاء کی رسالت پر یقین رکھتا ہو، وہ اس اخلاقی نظام پر یقین نہیں رکھ سکتا؛ کیونکہ ایسے شخص کے لئے خدا کے حکموں کی تعمیل سب سے زیادہ لذت بخش عمل ہو سکتی ہے، چاہے اس کا نتیجہ دنیاوی نقصان میں ہی کیوں نہ ختم ہو؛ اس وجہ سے، سب سے پہلے نفع اور مصلحت کے معنی کو سمجھنا ضروری ہے۔ اگر نفع سے مراد مادی لذت ہے تو یہ مکتب، مادیت پرستی کے نظام پر مبنی ہے جس کی اپنی خصوصی مشکلات ہیں، اور اگر نفع سے مراد مادی اور معنوی دونوں ہیں، تو بہت سی صورتیں ہیں جہاں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینی پڑتی ہے۔ اس صورت میں، ترجیح کا معیار کیا ہے؟ اور اگر نفع اور لذت سے مراد معنوی ہے، تو اس صورت میں، غایت گرائی کا مکتب نفی ہو جاتا ہے؛ کیونکہ معنوی فائدہ وظیفہ گرائی کے مکاتب میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اور اس عمل کے غایت کو مشخص کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ معنوی لذت اور فائدہ خود عمل کے انجام دینے میں چھپا ہو سکتا ہے، نہ کہ عمل کے نتیجے میں؛ اسی وجہ سے، امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر خدا نے جنت اور جہنم بھی پیدا نہ کی ہوتی، تو میں خدا کی عبادت کرتا؛ کیونکہ خدا عبادت کے لائق ہے

اور یہ عمل، معنوی لذت کا باعث بنتا ہے۔(مطہری، ۱۳۷۵: ص ۱۳۵)
۳) کچھ مفید اسکولوں کی توجہ کی تیسری شکل یہ ہے کہ یہ رائے (عوامی مفاد بنیادی خواہش ہے) نہ تو کوئی واضح تجویز ہے اور نہ ہی معقول تجویز ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ تمام انسانی سرگرمیوں کی سمت عوامی بھلائی ہو۔ کوئی شخص اپنا فائدہ عام لوگوں پر کیوں قربان کرے؟ اس اسکول میں، اس سوال کا کوئی قابل یقین جواب نہیں ہے۔ پروفیسر شاہد مطہری عوامی مفاد پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:
پہلا نقطہ: اخلاق کا دائرہ عمومی فائدے سے کہیں وسیع تر ہے۔ تمام مقدس اور شاندار انسانی عملیات غیر مفاد پرستی کی قسم کی نہیں ہوتیں؛ مثلاً ذلت قبول نہ کرنا؛ لہٰذا، وہ انسان جو ذلت قبول نہیں کرتا اور اس راہ میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے، قابل تعریف ہے؛ لیکن یہ عمل غیر مفاد پرستی یا عام فائدے سے متعلق نہیں ہے (مطہری، ۱۳۷۵: ص ۴۵)
دوسرا نقطہ: 'عام لوگوں' اور 'انسان' کی تعبیر کو تفسیر کی ضرورت ہے۔ کیا انسان یا لوگوں سے مراد وہی جانور ہے جس کا ایک سر اور دو کان ہوتے ہیں؟ کیا ہر جگہ ایسی مخلوق ملنے پر، حتیٰ اگر ان میں کچھ بدکردار اور جرائم پیشہ افراد موجود ہوں، ہمیں ان کے فائدے کے لئے کوشش کرنی چاہیے؟ یا انسان سے مراد نہ ہر انسان ہے، نہ بالقوہ انسان اور نہ ہی انسان کے خلاف انسان؛ بلکہ انسان جو انسانیت رکھتا ہے۔ ہر انسان جس کے پاس جتنی انسانی قدریں ہوتی ہیں، وہ دوستی کے لائق ہے اور جتنا کہ انسانیت سے محروم ہو جائے اور اگر بظاہر دیگر انسانوں کی طرح دکھائی دیتا ہو، (دشمنی کے لائق ہے۔ بظاہر،) چنگیز خان، یزید بن معاویہ، اور حجاج بن یوسف بھی انسان ہیں؛ لیکن وہ ایسے انسان ہیں جن میں انسانی قدریں نہیں ہوتیں؛ ایسے انسان جو انسانیت کے خلاف ہیں؛ لہٰذا انسان دوستی کو تفسیر کی ضرورت ہے۔ انسان دوستی کا مطلب ہے کہ ہر انسان جس کے پاس جتنی انسانی قدریں ہیں، وہ دوستی کے لائق ہے، اور وہ انسان جو فعلاً انسانی قدریں نہیں رکھتا، پھر بھی دوستی کے لائق ہے تاکہ اسے انسانی قدریں پہنچائی جا سکیں۔ ایک مکمل انسان، ایک انسان جس کے پاس انسانی قدریں نہیں ہیں، اسے بھی پسند کرتا ہے؛ لیکن نہ اس لئے کہ وہ اسے صرف پیٹ بھرنے کے لئے پسند کرتا ہے۔ وہ اسے نجات دینا چاہتا ہے اور اسے انسانی قدریں پہنچانا چاہتا ہے۔ اس معنی میں ہے کہ پیغمبر اکرم رحمۃ للعالمین ﷺ ہیں؛ تمام لوگوں کے لئے، خواہ کافر ہوں یا مومن، رحمت ہیں۔ (مطہری، ۱۳۷۵: ص ۴۶)
۲) واجبی نظریات: اخلاق میں فرض پر مبنی نظریات کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اعمال کی اچھائی یا برائی ان کے نتائج پر مبنی نہیں ہوتی؛ بلکہ خود عمل کی خصوصیات ہیں جو یہ طے کرتی ہیں کہ کوئی عمل اچھا ہے یا برا۔

مثلاً، احکام جیسے کہ 'سچ بولنا اچھی ہے' یا 'لوگوں کے ساتھ عدل سے پیش آنا چاہئے'، اگر ہم صرف عمل پر توجہ دیں، یعنی سچائی اور عدالت کو خود سچائی اور عدالت کی وجہ سے انجام دیں اور نہ کہ ان کے غایت اور نتیجہ کی وجہ سے، اور اگر سچائی اور عدالت کے نتائج، ان کی اچھائی یا برائی میں کوئی اثر نہ رکھیں، تو ایسا نظریہ فرض پر مبنی نظریات کہلاتے ہیں۔ اس بات میں کہ اخلاقی وظیفہ کو کون سا منبع مشخص کرتا ہے، اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جیسے کہ ایمیل دورکیم (۱۸۵۸-۱۹۱۹) کا خیال ہے کہ اس وظیفے کو معاشرہ مشخص کرتا ہے۔ (دورکیم، ۱۳۶۰: ص ۵۱؛ دورکیم، ۱۳۵۹: ص ۴۵۸)
کانت کا نظریہ: استاد شہید مطہری کے خیال میں، کسی نے بھی کانت کی طرح ضمیر کو اتنی اہمیت نہیں دی ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا کو عقلی دلیل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن ضمیر اخلاقی کے ذریعے اس کا ثبوت ممکن ہے۔ خود کانت ضمیر اخلاقی کے ذریعے خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ کانت ضمیری الہام کے قائل ہیں اور کہتے ہیں:
انسان اپنے ضمیر میں کچھ چیزوں کو ایک فرض اور حکم کے طور پر محسوس کرتا ہے جیسے ظلم نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، سچ بولو، دوسروں سے محبت کرو اور خیانت نہ کرو، اور ان اعمال کا کوئی مقصد یا غایت نہیں ہوتی سوائے خود عمل کے۔ اگر ضمیر کہے کہ میں یہ عمل کسی خاص مقصد کے لیے کر رہا ہوں، مثلاً کہے کہ سچ بولو تاکہ لوگ تم پر اعتماد کریں، تو یہ پھر اخلاقی نہیں ہے۔ (مطہری، ۱۳۷۵: ص ۶۵، ۳۰۲)
شہید مطہری کے نزدیک کانت نے خوشی اور کمال میں فرق کیا ہے:
خوشی ایک چیز ہے اور کمال دوسری چیز ہے۔ چونکہ ضمیر کے احکام مطلق اور بلاشرط ہوتے ہیں اور عمل کے نتائج پر توجہ نہیں دیتے، وہ کہتا ہے: چاہے عمل تمہارے لئے فائدہ مند ہو یا نہ ہو، خوشی لائے یا تکلیف، اسے انجام دو؛ پس یہ انسان کی خوشی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا؛ کیونکہ خوشی کا آخری معنی لذت ہے، لیکن ہر لذت خوشی نہیں ہے۔ جو لذت اپنے پیچھے تکلیف لائے وہ خوشی نہیں ہے۔ خوشی کا مطلب زیادہ سے زیادہ خوشی ہے۔ ضمیر خوشی سے کوئی مطلب نہیں رکھتا، وہ کمال سے مطلب رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے: تم یہ کام کرو کیونکہ یہ خود بخود کمال ہے؛ دوسروں کی خوشی چاہو کیونکہ یہ تمہارا کمال ہے۔ یہاں پر کانت نے خوشی اور کمال میں فرق کیا ہے۔ (مطہری، ۱۳۷۵: ص ۷۰)
شہید مطہری کا اخلاقیات دستوری پر نظریہ: استاد مطہری اخلاقیات دستوری کے حوزے میں ایک منفرد اور مدلل نظریہ پیش کرتے ہیں جسے پرستش کا نظریہ کہتے ہیں: جو اخلاقی عمل دوسروں کی تقدیس اور تعریف کا موضوع بنتا ہے، وہ پرستش کے زمرے میں آتا ہے۔ سوشل قوانین، الٰہی قوانین ہیں۔

خداوند نے انسان کے لئے دوطرح کے قوانین مقرر لئے ہیں: وہ قوانین جو انسان کی فطرت میں نقش ہیں اور دوسرے قوانین جو فطری قوانین سے نکلتے ہیں لیکن فطرت میں نہیں ہوتے؛ بلکہ انبیاء کے ذریعہ بیان لئے جاتے ہیں۔ انبیاء فطری قوانین کی تصدیق کے ساتھ انسان کے لئے کچھ اضافی قوانین بھی لاتے ہیں۔ وہ انسانی روح کی گہرائی، انسانی فطرت، انسانی دل کی گہرائی، ایک خاص نادانستہ خوبی کے ساتھ خدا کو پہچانتا ہے؛ یہ قوانین خدا کو پہچانتا ہے، خدا کی خوشنودی کو پہچانتا ہے اور فطرتاً عمل خدا کی رضا کے لئے انجام دیتا ہے؛ لیکن خود نہیں جانتا کہ وہ خدا کی رضا کی راہ میں قدم رکھ رہا ہے۔ کیا وہ شخص جو نادانستہ طور پر ایسے فطری پر ایسے فطری قوانین کی پیروی کرتا ہےجیسے کافر، کیا ایسے اعمال کا خدا کے نزدیک اجر ہے؟ جواب یہ ہے کہ بے اجر نہیں ہے۔ (مطہری، ۱۳۷۵: ص ۱۲۸)

بلند اخلاقیات: بلند اخلاقیات اخلاقی تعبیرات جیسے کہ 'اچھا'، 'برا'، 'چاہئے' اور 'نہیں چاہئے' کے فلسفیانہ تجزیے پر مبنی ہے؛ اس وجہ سے، یہ اخلاق دستوری کے مطابق ہے اور اس میں اُن الفاظ اور مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اس میں استعمال ہوئے ہیں۔ کیا 'اچھائی' کی کوئی حقیقی بیرونی موجودگی ہے یا یہ ایک انتزاعی مفہوم ہے؟ کیا اچھائی کچھ ایسی چیز ہے جیسے رنگ جو ہم دیکھ سکتے ہیں یا کچھ ایسی چیز ہے جیسے درد جو ہم محسوس کر سکتے ہیں؟ حالیہ برسوں میں، زبان کے تجزیے پر فلسفہ کی بڑھتی ہوئی توجہ کی وجہ سے، اس شاخِ فلسفہ اخلاق کو زیادہ نمایاں مقام حاصل ہوا ہے۔ (پالمر، ص ۱۱)

یہ نظریات تین عمومی زمرہ جات میں درج کئے جا سکتے ہیں:

۱) اخلاقی فطرت پرستی: یہ نظریہ یہ مانتا ہے کہ تمام اخلاقی بیانات کو غیر اخلاقی، خاص طور پر حقیقت پسندانہ، تحقیقاتی یا ثابت شدہ بیانات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

۲) اخلاقی غیر فطری ازم (یا وجدانیت) (Ethical Non-Cognitivism): جارج مور، جو کہ اخلاقی طبیعت گرائی کے تمام اشکال میں نیچرلسٹک فالیسی کو نافذ کرتا دیکھتا ہے، اپنا نظریہ جسے اخلاقی شہود گرائی کہتے ہیں، پیش کرتا ہے۔ ہم اخلاقی شہود کے ذریعے جان سکتے ہیں کہ کوئی اخلاقی بیان سچا ہے یا جھوٹا؛ کیونکہ ہم بلاواسطہ طور پر 'خوبی' کی خصوصیت کو محسوس کر سکتے ہیں؛ مگر یہ خصوصیت کیا ہے؟ مور کہتا ہے کہ یہ خصوصیت منفرد اور غیر قابل تعریف ہے۔ خوبی ایک ایسی چیز ہے جسے اگرچہ تجزیہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم تصدیق کر سکتے ہیں کہ کوئی فرد اس کا حامل ہے یا نہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ خوب اور خیر کیا ہے، جواب یہ ہے کہ خوب، خوب ہی ہے۔ یہ اس بارے میں کہا جا سکنے والی انتہائی بات ہے۔ یا اگر پوچھا جائے کہ خوب کی تعریف کیسے کی جائے، جواب یہ ہے کہ خوب کی تعریف نہیں

کی جا سکتی؛ کیونکہ یہ بسیط اور غیر مرکب ہے۔ دیگر چیزیں خوب سے تعریف کی جاتی ہیں؛ لیکن خود خوب تعریف ناپذیر ہے۔(مور ۱۹۰۳:ص ۶،۹)

۳) اخلاقی عدم ادراک(Ethical Naturalism): اخلاقی فطرت پرستی اور اخلاقی انتشار پسندی دونوں بلند اخلاقیات کے شناختی نظریات ہیں۔ یہ دونوں دعویٰ کرتے ہیں کہ اخلاقی دعوے کچھ شناخت کا اظہار کرتے ہیں؛ مگر اخلاقی عدم ادراک کا نظریہ یہ ہے کہ اخلاقی دعوے غیر شناختی ہیں اور کوئی شناخت ظاہر نہیں کرتے۔ انگلش فلاسفر آئر، اپنی کتاب 'زبان، حقیقت اور منطق' میں مانتے ہیں کہ ان کا مکمل فرض جذباتی ہے اور یہ صرف ان لوگوں کے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں۔ اس حد تک، یہ چیخ و پکار، سسکیوں یا خوشی کی آوازوں کی طرح ہیں یا دوسروں میں جذبات کو بھڑکانے یا عملی تحریک دینے کے لئے ہیں۔ مثال کے طور پر، جو شخص کہتا ہے: 'مجھے درد ہو رہا ہے'، وہ بیان کر رہا ہے کہ اسے درد ہے اور اگر واقعی اسے درد ہے تو دعوی سچا ہے اور اگر نہیں تو جھوٹا ہے؛ لیکن جو شخص کہتا ہے: 'اوہ'، وہ کچھ بھی اظہار یا بیان نہیں کر رہا ہے۔ 'اوہ' صرف اس کے درد کا اعلان کرتا ہے۔(آئر ۱۹۴۶:ص ۱۰۲؛ پالمر، ۱۹۹۵:ص ۱۵۸)

شہید مطہری بلند اخلاق کے بارے میں اپنے نظریے میں خوبی اور بدی کے بارے میں کہتے ہیں:
خوبی اور بدی ہونے اور نہ ہونے کی طرح ہے؛ بلکہ اصل میں خوبی، خود ہونے کی چیز ہے اور بدی، نہ ہونے کی چیز ہے۔ جہاں بھی بدی کی بات ہوتی ہے، وہاں ہمیشہ کچھ نہ ہونے کی یا کمی کی بات ہوتی ہے۔(مطہری، ۱۳۵۹:ص ۱۴۴)

اخلاقی کاموں اور بدصورتیوں کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ظلم برا ہے کیونکہ یہ مظلوم کے حق کو پامال کرتا ہے۔ حق وہ چیز ہے جس کا کوئی موجود استحقاق رکھتا ہے اور اسے ملنا چاہیے؛ مثال کے طور پر، علم انسان کے لئے ایک کمال ہے جس کی انسانی صلاحیت طلب کرتی ہے اور اس کی طرف راغب ہوتی ہے اور اسی وجہ سے، اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ اگر کسی سے تعلیم کا حق چھین لیا جائے اور اسے تعلیم دینے کی اجازت نہ دی جائے، تو یہ ظلم اور برائی ہے؛ کیونکہ یہ کمال کے حصول میں رکاوٹ ہے اور فقدان کا باعث بنتا ہے؛ لہذا، دنیا میں جو کچھ بھی موجود ہے، اس کی موجودگی کی حیثیت سے، خوبی اور خیر ہے اور برائیاں بھی نہ ہونے کی قسم کی ہیں۔ یہ نظریہ خوبی اور برائی کے بارے میں پچھلے نظریات کی خامیوں سے محفوظ ہے۔

منابع و مآخذ: الف: فارسی

۱) دورکیم، امیل، 'تقسیم کار اجتماعی'، ترجمہ حسن حبیبی، تہران، ۱۳۵۹ش۔
۲) مطہری، مرتضی، 'عدل الہی'، دوم، انتشارات صدرا، قم، ۱۳۵۹ش۔
۳) دورکیم، امیل، 'فلسفہ و جامعہ شناسی'، ترجمہ فرحناز خمسہ ای، تہران، ۱۳۶۰ش۔
۴) کاپلسون، فردریک، 'تاریخ فلسفہ'، ترجمہ سید جلال الدین مجتبوی، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۶۸ش۔
۵) مطہری، مرتضی، 'فلسفہ اخلاق'، پانزدہم، انتشارات صدرا، قم، ۱۳۷۵ش۔
۶) مطہری، مرتضی، 'آشنایی با علوم اسلامی'، بیست و چہارم، انتشارات صدرا، قم، ۱۳۷۹ش۔

ب: لاتین

1. Palmer, Michael, Moral Problems, the Lutterworth Pres, Cambridge, 1995.
2. Moore, G. Principia Ethica, Cambridge University Press, Cambridge, 1903.
3. Ayer. A.J. Language, Truth and Logic, Victor Gollancz Ltd, London, 1946.
4. Acton, H.B. "Kant's Moral Philosophy", in New Studies in Ethics, Vol, I, ed: Hudson, W.D. Macmillan Press, London, 1974.
5. Kant, Immanuel, Critique of Practical Reason, Tr, Beck, L.W. the Library of Liberal Arts, New York, 1956.
6. Kant, Immanuel "Groundwork of Metaphysic of Morals", Tr, Paton, H. pp. 53-123, in: the Maral Law, Hutchinson University Library, 1970.

☆☆☆

Izhar-ul-Islam : Bahaisiyat Afsana Nigar by Zeenat Parween (Research Scholar, Dept. of Urdu Rani Ganj Girls College, Rani ganj)

زینت پروین (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، رانی گنج گرلس کالج، رانی گنج)

اظہارالاسلام بحیثیت افسانہ نگار

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ۱۹۷۰ء کے بعد جو نئی نسل سامنے آئی اس میں اظہارالاسلام کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی پیدائش ۱۰ فروری ۱۹۴۹ء میں شہر رانی گنج میں ہوئی۔ انہیں بچپن سے مطالعے کا شوق کا تھا۔ مطالعے کے اسی شوق و ذوق نے انہیں تخلیقی ادب کی طرف مائل کیا۔ ان کی پہلی کہانی ''کہرا اور کرن'' ۱۹۷۷ء میں رسالہ 'شاعر' میں شائع ہوئی اور یہی سے انہوں نے ادبی دنیا کا سفر طے کیا۔ ان کی یہ کہانی ادبی و علمی حلقے میں بے حد پسند کی گئی اور انہیں مقبولیت بھی ملی۔ اس کے بعد ان کی دیگر افسانے ہندو پاک کے مشہور اور معیاری رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''واپسی'' ۱۹۹۶ء اور ''کانچ کا پل'' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر افضال عاقل نے ان کے افسانے کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''اظہارالاسلام کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اس لئے ان کے افسانوں کے مطالعے میں گہرائی و گیرائی دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے افسانے کم تعداد میں ہی نظر آتے ہیں لیکن کم افسانوں کے باوجود ان کا قد اور دوسرے افسانہ نگاروں میں اونچا نظر آتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے موجود دوسری دنیا سے اخذ کردہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ جہاں رہتے ہیں اس کے آس پاس یا اردگرد کے ماحول سے اپنے افسانوں کا موضوع چن لیتے ہیں اور فنی خوبیوں کے ساتھ افسانوی شکل دے دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے عصری معنویت آج بھی برقرار ہے۔''

(بحوالہ ''اظہارالاسلام کے افسانوں میں عصری معنویت''، مشمولہ اظہارالاسلام حیات وفن، ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا، ۲۰۲۰ء، اضحیٰ پبلی کیشنز، ص ۷۲)

واپسی میں شامل ان کا پہلا افسانہ ''اجنبی'' ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے انسانی فطرت کو بیان کیا ہے۔ اگر کبھی کوئی شخص کسی کو اچانک دیکھ لے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس نے وہ شخص کو

کہاں دیکھا۔۔ایسا ہی کچھ 'اجنبی' کے کردار کے ساتھ بھی ہوتا ہے جس کو پڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک انوکھے انداز میں انسانی فطرت کو موضوع بنایا ہے۔اقتباس دیکھیں:

''پارکنگ شیڈ میں اسکوٹر چھوڑ کر وہ اپنے چمبر کی طرف بڑھا کاریڈر میں اسٹاف کے کچھ لوگ چہ میگوئیاں کررہے تھے۔چمبر کے قریب پہنچ کر اس کی نگاہ یوہی پی۔اوکی پر پڑ گئی کسی کی پیٹھ ادھر تھی اور پی او اس سے باتیں کر رہا تھا۔اچانک وہ کسی ضرورت سے داہنی طرف جھکا اور اس کا گورا چٹا چہرہ سامنے آگیا۔وہ یکا یک کھوسا گیا۔کہاں دیکھا ہے؟ کہاں دیکھا ہے؟اس کے ذہن میں پھر بگولے سے اٹھنے لگے۔'' (افسانہ،اجنبی ص ۱۷)

اظہارالاسلام نے کئی افسانوں میں استحصال کو موضوع بنایا ہے۔انہوں نے اپنے مشاہدات و تجربات سے سماجی ،سیاسی ،معاشی اور ذہنی استحصال کو بڑے ہی چابکدستی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔'واپسی' میں شامل زیادہ تر افسانے جنسی استحصال پر مبنی ہیں۔اظہارالاسلام نے افسانوں میں جنس کے ساتھ ساتھ سماج کے مختلف موضوعات کو بڑے ہی سلیقے سے پرویا ہے۔'ڈیڑھ منزلہ سورج' اظہار صاحب کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔اس افسانے میں انہوں نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں علامتوں کی مدد سے جنس میں پھنسی ایک لڑکی کی روداد کو بیان کیا ہے اور جس طرح انہوں نے اس لڑکی کے استحصال کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے قاری کو اس لڑکی سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔افسانے کا آخری اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کتا سڑک پار کر کے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔اس نے نگاہ کا پتھر اٹھایا۔مگر وہ ڈرے بغیر اسکے قریب چلا آیا۔چلوگی؟ وہ آہستگی سے بھونکا۔۔''ہاں۔۔چلوں گی ۔۔'' اور ساتھ ہی اس نے سارا زہر فٹ پاتھ پر اگل دیا۔پھر کتے کی دم پکڑ کر اس فٹ پاتھ سے اس فٹ پاتھ پر پہنچ گئی۔''

(ڈیڑھ منزلہ سورج،ص ۳۳)

افسانہ ''دائرہ'' میں اظہارالاسلام نے wife swaping کو بیان کیا ہے۔جس میں رشتوں کی پامالی اور جنسی بے راہ روی کو انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔اس افسانے میں آفس میں کام کرنے والے تین آدمی ایک دوسرے کے بیویوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم رکھتے ہیں۔تعجب کی بات یہ ہے کہ بیوی بھی اس جنسی تعلق سے مطمئن ہے۔اس افسانے میں اظہار صاحب نے جدید دور کے ایک المناک روپ کو دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے

ہیں۔افسانہ ''وہ آدمی'' میں کرپشن اور رشوت خوری کو موضوع بنایا ہے اور کہانی کار کے ضمیر کو غائب کی شکل میں علامت کے طور پر پیش کیا ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔جب تک کہانی کار رشوت سے پاک تھا اس کا ضمیر اسے دیکھ کر مسکراتا ہے پر جیسے ہی وہ اس دل دل میں پھنس جاتا ہے اس دن کہانی کار کا ضمیر مر جاتا ہے۔افسانے کا اختتام دیکھیں:

''چھٹی بریف کیس لے کر میں دفتر کے پچھلے دروازے سے نکلتا ہوں۔وہ آدمی آج مجھے اندر سے پریشان کر رہا ہے۔اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔کہیں بھی جائے پناہ نہیں۔میں کب تک اپنی نظریں چراتا رہوں۔سامنے فٹ پاتھ پر دھواں دھار برستے پانی میں اس کی لاش بھیگ رہی ہے۔۔'' (وہ آدمی، ص ۱۴)

اظہار الاسلام کا پہلا افسانہ ''کہر اور کرن'' جو جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہے اور ان میں حقیقت پسندی کی جھلک بھی نمایاں ہے۔اس افسانے میں ایک غریب بڑھیا اور اس کے ساتھ تین چھوٹے بچوں کے ساتھ ہوئے بُرے برتاؤ کو دکھایا گیا ہے۔افسانہ ''پوسٹ مارٹم'' میں پولیس اور ڈاکٹر کے روپ میں چھپے حیوانیت کو دکھایا ہے کہ کس طرح ایک ادھ مری لڑکی کے ساتھ عصمت دری کر کے اسے پوری طرح مار دیتا ہے اور اس کے خیر خواہ کے اوپر الزام لگا کر اس کا encounter کروا دیتا ہے۔افسانہ '' آخری شب کا کرب'' میں اظہار الاسلام نے اندھ وشواس کو موضوع بناتے ہیں۔افسانہ میں اماوس کی رات کو کہانی کار کی بیوی کو دورے پڑنا، درخت کے جڑ پر پیشاب کرنے سے بڑھیا کا کہنا کہ ایسا کرنے سے پریشانی میں مبتلا رہوں گئے۔بلی کا رونا، الو کا چیخنا اور پرانے پیڑ کو کاٹنے پر مصیبت کا آنا، وغیرہ جیسے ابدھ وشواس کی باتیں کو اظہار صاحب نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔افسانہ ''پرندے'' جو ذہن جدید شمارہ ۶۰۔۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس افسانے میں آواگون کا چلن اور جنریشن گیپ کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔اظہار الاسلام کا افسانہ ''چہکار'' میں ٹکنالوجی اور موبائل ٹاور کے وجہ سے پرندوں کی تعداد میں دن بہ دن ہونے والے کمی کو بیان کیا گیا ہے۔اظہار الاسلام نے جادوئی حقیقت نگاری کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔اظہار الاسلام عصرِ حاضر کے ایک ایسے افسانہ نگار گزرے ہیں جن کے افسانوں کے موضوعات بہت وسیع ہیں۔انہوں نے اپنے اردگرد کے تمام واقعات کو بہت ہی سلیقے سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ان کے افسانے اردو ادب کے لیے سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح ہے باقی سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

Qurrat-ul-ain Hyder ki Reportage Nigari ka Mukhtasar Jaeza by

Yasmin Kausar (Research Scholar, Dept. of Urdu AMU Aligarh

یاسمین کوثر (ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ)

قرۃ العین حیدر کی رپورتاژ نگاری کا مختصر جائزہ

قرۃ العین حیدر کا شمار اردو ادب کی مایہ ناز شخصیات میں ہوتا ہے۔اردو ادب کو انھوں نے اپنی بے شمار تخلیقات سے نوازا ہے۔افسانوی ادب کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے غیر افسانوی ادب پر بھی طبع آزمائی کی اور کیا خوب کی ۔جس طرح ان کے ناول اور افسانوں کو افسانوی نثر میں مقبولیت حاصل ہوئی تھی اسی طرح غیر افسانوی نثر میں ان کے رپورتاژ بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے رپورتاژ کے دو مجموعے ’’**کوہ دماوند**‘‘ اور ’’**ستمبر کا چاند**‘‘ کے نام سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔کوہ دماوند میں چھ اور ستمبر کا چاند میں چار رپورتاژ شامل ہیں۔

۲۔لندن لیٹر: لندن لیٹر قرۃ العین حیدر کا پہلا رپورتاژ ہے جو سب سے پہلے رسالہ ’’نقوش‘‘ سے ۱۹۵۳ میں شائع ہوا۔لندن لیٹر ان کے رپورتاژ کے مجموعے ستمبر کا چاند میں شامل ہے۔اس رپورتاژ کا آغاز ایک مختصر سے دیباچے سے کیا گیا ہے جس میں انھوں نے لیٹر کی اقسام بتائی ہیں اور لندن لیٹر لکھنے کا مقصد بھی بتایا ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے رپورتاژ نگاری کے فن اور اصول پر بات بھی کی ہے۔لندن لیٹر آنکھوں دیکھے حال کی وہ تحریری شکل ہے جس میں مصنفہ کی شمولیت ابتدا تا اخیر ظاہر ہوتی ہے۔اس کا آغاز انھوں نے آزادی کے احساس کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ آزادی نے نئی نسل کو نئی زندگی سے واقف کرایا جس سے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔اس رپورتاژ میں انھوں نے لندن کے مسلمانوں کی تعداد،ان کی معاشی صورت حال،تحریر و تقریر کی آزادی، بے روزگاری ،غریبی اور پس ماندگی انگروں کی نفسیات ،وہاں کی تہذیبی زندگی ،تھیٹر آرٹ کی نمائش، ہندوستانی رقص وغیرہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ مسئلہ اسرائل و فلسطین اور ادبی رجحانات پر بھی بات کی ہے ۔یہ روداد اپنے آپ میں معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے ۔ایک خط کے ذریعے ایک ملک کی تہذیب اس کے سیاسی و سماجی مسائل اور مختلف ممالک سے آئی شخصیات کو قاری سے متعارف کرانے

کا کام بھی کیا ہے۔

۲۔درچمن ہرورقی دفتر حال دیگرست: یہ رپورتاژ رسالہ ''نقوش'' لاہور سے ۱۹۶۸ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔اس رپورتاژ میں مصنفہ نے بنی اسرائل کی تاریخ کا جائزہ پیش کیا ہے۔مذہب اور تاریخ کے حوالے سے ۱۲۲۷ قبل مسیح سے لے کر عہد عباسیہ تک کے دور کے متعدد معارکوں،تہذیبی نشیب و فراز،مذہبی ادوار،لسانی تبدیلیوں اور مختلف سلطنتوں کا ذکر اپنے حاص انداز میں بیان کیا ہے۔تاریخی واقعات کا بیان اور مذہبی معلومات کا ایک ذخیرہ اس رپورتاژ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

۳۔کوہ دماوند: قرۃ العین حیدر کا یہ رپورتاژ'' آج کل'' دہلی میں ۱۹۶۸ء مارچ کے شمارے میں شائع ہوا۔اس رپورتاژ میں ملکہ ایران کے ملکہ بننے کی کہانی ہے جو ایک معمولی ایرانی لڑکی تھی۔وہ اپنی سوانح عمری لکھوانے کی خواش مند تھی۔رمیش سنگھوی جو ایک جرنلسٹ تھے انھوں نے قرۃ العین حیدر سے ان کی سوانح لکھنے کا مشورہ دیا۔اسی سلسلے میں وہ ایران شاہ بانو سے ملنے جاتی ہیں وہاں ملکہ ایران انھیں اپنی حالات زندگی کے مختلف گوشوں سے روشناس کراتی ہیں جنھیں بعد میں مصنفہ نے تحریری شکل دی ہے۔اس رپورتاژ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے دونوں کا تعلق الگ الگ واقعات سے ہے ۔رپورتاژ کے پہلے حصے میں رسم تاج گذاری،شہنشاہ آریہ مہر رضا شاہ پہلوی و فرخ دیبا کے جشن کی تقریب کے احوال اور دوسرے حصے میں کتاب تحریر کرنے کو حالات اور اپنے سفر،سیاحت کا احوال تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۴۔ گل گشت: یہ رپورتاژ رسالہ'' گفتگو'' ممبئی سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔یہ ایک طویل رپورتاژ ہے۔جو روس اور کشمیر پر مبنی ہے۔یہ رپورتاژ ۱۹۷۴ء میں ماسکو یونی ورسٹی میں منعقد کانفرنس سے شروع ہوتا ہے اور مہاراجہ ہری سنگھ جموں کے محل پر ختم ہوتا ہے۔اس کانفرنس کا انعقاد آل انڈیا ریڈیو اردو کنوینشن نے کیا اور محترمہ اندرا گاندھی نے اس کانفرنس کی صدارت کی۔مصنفہ روسی حکومت کی دعوت پر کئی روسی کتابوں کے ترجمے کے صلہ میں عطا کردہ'' سویت لینڈ نہرو اوارڈ'' لینے گئی تھیں ۔انھوں نے اس رپورتاژ میں روس کی ادبی کانفرنس کے آنکھوں دیکھے حال کو ادبی چاشنی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔روس کی سماجی فضاء اور وہاں کے حالات اور ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے روس کے عروج و زوال کی حقیقت بھی بیان کی ہے۔اس کے علاوہ اس میں ادیبوں کا شاندار خیر مقدم،قیام و سیاحت کا انتظام اور ان کی بحث و مباحث کو دل کش انداز میں اس رپورتاژ میں تحریر کیا گیا ہے۔یہ ایک طویل تاریخی سفر کی روداد ہے۔

۵۔ستمبر کا چاند: یہ قرۃ العین حیدر کا ایک مقبول ترین رپورتاژ ہے جو پہلی مرتبہ ''نقوش'' لاہور سے ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا۔اس رپورتاژ کا موضوع جاپان میں ہونے والی ادیبوں کی بین القوامی کانفرنس ہے۔یہ کانفرنس ۱۹۵۷ء میں ستمبر میں جاپان کی راجدھانی ٹوکیو میں منعقد ہوئی تھی ۔اس کانفرنس میں تقریباً اٹھارہ سوملکی اور غیر ملکی ادیبوں اور اٹھائیس مما لک کے **۲۰۰** مصنفین نے شرکت کی تھی۔اگر چہ اس رپورتاژ میں کانفرنس کی روداد بیان کی گئی ہے مگر مصنفہ نے اس میں جاپان ،فلپائن تھائی لینڈ سے لے کر ہانگ کانگ تک کے وہ سارے مناظر پیش کیے جو اس خطے کی تاریخی تہذیبی ثقافتی اور سیاسی صورت حال کو پیش کیا ہے۔دوسری جنگ عظیم ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی تعمیر نو کا ذکر بھی کیا ہے۔اس حملے کے بعد جاپانیوں کے مزاج اور جفاکشی میں کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔قرۃ العین حیدر نے اس رپورتاژ میں اجلاس میں شریک ادیبوں کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات و احساسات کا بیان بھی کیا ہے۔اس رپورتاژ میں کرداروں کی بہتات ہے لیکن ہر شخص کا تعارف موقع کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔انھوں نے ان تمام شخصیات کی گفتگو اور ان کے بیانات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کانفرنس میں موجود تمام شخصیات امن کے خواہش منداور ظلم وتشدد اور جنگ کے خلاف احتجاجی رخ رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں

۶۔جہان دیگر: یہ رپورتاژ ''مکتبہ ادب لاہور'' سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔اس رپورتاژ میں ذیلی عنوانات کے تحت مختصر صفحات پر مشتمل کل ۱۷ مضمون لکھے گئے ہیں۔پہلا ''اڑن ہاتھی اور بڑھیا کا تنور'' جس میں امریکی تسلط اور مسلمانوں کی بے حسی اور فضول خرچی پر طنز کیا گیا ہے اس میں جہد البقا میں ہارنے اور جیتنے والوں کی روداد کا بیان بھی شامل ہے ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ ظفریاب وہی ہوتے ہیں جنھوں نے خود کو فطح کے اہل بنایا ہوتا ہے۔دوسرا ''صوراسرافیل'' جو ایک انوکھی طرز کا مضمون ہے اس میں انھوں نے الارم سسٹم کو صوراسرافیل سے تشبیہہ دی ہے۔اس مضمون میں مصری تہذیب کی جانکاری بھی ملتی ہے۔تیسرا ''ہواؤں کا شہر'' سے مراد شکاگو ہے مصنفہ کو یونی ورسٹی اور شکاگو کے صدر شعبہ اردو چودھری محمد نعیم نے دعوت دی جس کی وجہ سے یہ مضمون وجود میں آیا۔اسی طرح اس رپورتاژ میں اور بھی ذیلی عنوانات کے تحت رپورتاژ شامل ہیں جن کے نام مور کی آخری آہ،گل آفتاب،کوہرے میں چھپے جزیرے،حیاباں حیاباں ارم نادیہ،لیلی فاطمہ،دور کی بانسری کے سر،سوپ اوپیرا سن شائن اسٹیٹ،فرشتوں کی ملکہ مریم کا شہر،کاؤ بوائے اور ریڈ انڈین،تنہا ستارہ،ڈسکی مون،الفا اور اومیگا وغیرہ۔ان عناوانات کے تحت مصنفی نے امریکہ کے مختلف مقامات اور امریکی

تہذیب کومختصرانداز میں پیش کیا ہے۔

۷۔ چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا: یہ رپورتاژ جزایرٔ انڈومان اورنکوبار پر مشتمل ہے۔رپورتاژ کی ابتدا میں انڈمان ونکوبار جزائر کے حالات وکلچر کو پیش کیا ہے وہاں کے مقامات کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشرتی ماحول کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔مصنفہ نے انڈومان میں اپنی قیام گاہ 'بورہ بنگلہ' میں اپنے بچپن کے گزارے ہوئے دنوں کا ذکر بھی پیش کیا ہے۔ان کے والد سجاد حیدر یلدرم کو ریونیوااسسٹنٹ کمشنر بنا کر پورٹ بلییرٔ بھیجا گیا تھااس سفر میں قرۃالعین حیدراپنے والد کے ساتھ تھیں جس کے کئی سالوں بعدانھوں نے یہ رپورتاژلکھا۔

۸۔دکن سانہیں ٹھارسنسار میں: قرۃالعین حیدر نے دکن کا سفرکیااوراپنے تاثرات مختصرسی روداد میں قلم بند کیے۔اس رپورتاژ کا آغاز ان کے دکن کی واپسی کے سفر سے ہوتا ہے۔جس میں انھوں نے سفر میں پیش آئے واقعات اور مقامات کوخوبصورتی سے بیان کیا ہے۔حیدرابادکی تاریخ عہد قطب شاہی سے لے کرعہدآصفیہ تک دہرائی ہے۔حیدراباد میں وہ حیدرآباد یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی،انجمن ترقی اردو،ادارہ ادبیات اردو،قدیم عمارات،سالار جنگ میوزیم،اعوان اردواوراردو حال جانے اورایک کانفرنس میں شرکت کا بیان ہوا ہے۔کانفرنس کے ادیبوں میں مخدوم محی الدین،ڈاکٹر زور،ڈاکٹرحسینی شاہد،یوسف سرمست اورمجتبی حسین وغیرہ ادیبوں سے ان کی ملاقات کا ذکر بھی شامل ہے۔یہ رپورتاژ تاریخی سماجی ثقافتی اورادبی معلومات سے مزین ہے۔

۹۔خضرسوچتاہے وولر کے کنارے: یہ رپورتاژوادی کشمیر کی سیاحت پر مبنی ہے۔انھوں نے اس میں کشمیرکی وادیوں کی خوش گوارفضاءآب وہوا،باغوں اور پھولوں کے ساتھ ساتھ مغلوں کی تجارت وغیرہ کا ذکرنہایت مؤثرانداز میں کیا ہے۔یہ رپورتاژبھی ذیلی عنوانات کےتحت لکھا گیا ہےجن مین باغ سلمان،راج ترنگنی،رنجن شاہ،بڈ شاہ،یوسف شاہ،کوہ کے دامن میں وہ غم دہقان پیر،خانقاہ معلٰی کے مجاہد،رخت با کاشمرکشا،اورکہ یہ عشق سارامحمدی ہے۔انھوں نے کشمیر کے سفر کے دوران وہاں کے مقبروں کا بھی دورہ کیا جن میں سلطان زین العابدین کی والدہ کا مقبرہ،بڈشاہ کا مزار،اورسلطان حیدرشاہ کاشعری وغیرہ کا بیان شامل ہے۔

۱۰۔قیدخانے میں طلاطم ہے کہ ہندآتی ہے: یہ رپورتاژایک طرح سےنثری مرثیہ ہے۔قرۃالعین حیدر نے سارے عالم کی بدنظمی،ظلم وجبر،جنگ وجدال،بدکاریوں،حقوق کی پامالی،حرس وہوس اورغربت و لاچاری کا منظر بڑے ہی افسوس ناک پیرائے میں پیش کیا ہے۔مصنفہ کے نزدیک تہذیب وتمدن کا

تماشہ بنا ہوا ہے۔ ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی غیر محفوظ ہے اب ہر ملک بس پاورفل بننا چاہتا ہے جدید ترین نیوکلیائی ٹیکنالوجی خریدنے کی ہوس میں ہر ملک روپیہ صرف کرتا ہے ہر کوئی ترقی یافتہ ملک کی صف میں کھڑا ہونا چاہتا ہے۔انھیں اپنے ملک کی عوام کی غریبی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس رپورتاژ میں مصنفہ نے سارے عالم میں قتل وغارت گری کے بازار اور انسانی قدروں کے خون اور تہذیب وتمدن کی پامالی کا بیان کیا ہے۔المختصر قرۃ العین حیدر کی رپورتاژ نگاری کے اس جائزے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مختصر اور طویل دونوں طرح کے رپورتاژ لکھے گئے ہیں۔ان رپورتاژ میں انھوں نے موضوع کے اعتبار سے معروضی نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے اور حقیقی واقعات کے بیان کے ساتھ ہی شخصی تاثرات وکیفیات کا بیان بھی ان کے یہاں بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ان کی تمام تحریریں بڑی وسیع النظری کا تقاضہ کرتی ہیں کیونکہ مصنفہ ایک نہایت ہی ذہین شخصیت کی مالک ہیں۔ان کے تجربوں اور مشاہدوں کی گہرائی کی وجہ سے ہی ان کے بیان کردہ واقعات میں تنوع پیدا ہوا ہے۔ان کے رپورتاژ دستاویزی صداقت واہمیت کے حامل ہیں۔رپورتاژ نگاری کے فن میں قرۃ العین حیدر کے ان رپورتاژ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات:

۱۔اردو کے منتخب رپورتاژ: ڈاکٹر طلعت گل

۲۔اردو رپورتاژ تاریخ وتنقید: ڈاکٹر طلعت گل

۳۔ستمبر کا چاند: قرۃ العین حیدر

۴۔کوہ دماوند: قرۃ العین حیدر

۵۔اردو ادب میں رپورتاژ نگاری، ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر جاوید اقبال مغل

۶۔اردو میں رپورتاژ نگاری فن اور ارتقا: ڈاکٹر ایس۔ایم۔زیڈ گوہر۔

☆☆☆

Mulla Hadi Sabzwari aur unki sharah Masnavi Rumi by Irfan Rupani

(research Scholar, dept. of Persian Mumbai University, Mumbai)

عرفان روپانی (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی)

ملاہادی سبزواری اوران کی شرح مثنوی رومی

بیہاق ضلع کے سبزوار کے قصبے میں مہدی کے بیٹے ہادی کی پیدائش کے موقع پر۔ سبزوار، مشھد کے مغرب میں تقریباً 230 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے لیے وقف ایک مشہور روضہ شہر، علم کا ایک اہم مرکز تھا۔ بعد کے سالوں میں، یورپی سیاحوں اور اسکالرز، آرتھر ڈی گوبینو اور ایڈورڈ براؤن نے ہادی سے اس کی شہرت کے عروج پر سامنا کیا۔ براؤن نے انہیں " آخری عظیم اسلامی فلسفی" کے طور پر سراہا ہے۔ پاکستانی فلسفی شاعر محمد اقبال نے انہیں اسلامی فکر کی فکری تحریک کو افلاطونیت کی طرف منتقل کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ سبزواری کے تھیوسفی کے اسرار (اسرار الحکم) کے تجزیہ میں۔

سبزواری کی خدمات: سبزواری، ایک انتہائی قابل مصنف، ان کی ادبی شراکت اور پائیدار اثر و رسوخ پر بحث کی ضمانت دیتا ہے، خاص طور پر جیسا کہ ان کے طلاب کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ سبزواری کے فلسفے کے نصاب کا سنگ بنیاد آٹھ سال پر محیط تھا، جو بنیادی طور پر ملا صدرا کے کاموں پر مرکوز تھا، جو ان کی تعلیم کو الگ کرتا ہے۔ فلسفیانہ تصوف (عرفان) میں زیادہ دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انھوں نے مکتبہ ابن عربی کی اہم تحریریں پڑھائیں۔ سبزواری، خراسان، ایران میں 1212/1797 یا 1213/1798 میں پیدا ہوئے، سبزواری کی عربی گرامر اور زبان سے ابتدائی واقفیت سات یا آٹھ سال کی عمر میں شروع ہوئی۔ اپنے کزن ملا حسین سبزواری کی رہنمائی میں، انہوں نے ایک دہائی تک مشھد میں فقہ، منطق اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب ان کے اندر الہیات اور اشراق کے بیج پھوٹنے لگے، جس سے وہ روحانی فلسفہ کی تلاش میں اصفہان روانہ ہوئے۔ عربی اور فارسی نثر اور شاعری میں سبزواری کا ادبی سفر دانشورانہ تحقیق اور روحانی تحقیقات کی تبدیلی کی طاقت کا ثبوت ہے۔ متنوع فلسفیانہ روایات کی ترکیب، ان کی تحریروں میں صوفی مابعد الطبیعیات کے ساتھ گہری مشغولیت، ان کے عہد میں فارسی فلسفے کی وسعت اور گہرائی کو نمایاں کرتی ہے۔ سبزواری کی زندگی وجود کے اسرار کی تلاش میں جغرافیائی حدود کو عبور کرتے ہوئے حکمت کے متلاشی کی انتھک جستجو

کی ایک متاثر کن داستان کے طور پر کام کرتی ہے۔
ایک صوفی تھیم کا استعمال کرتے ہوئے جس نے قانون، روحانی راستے اور سچائی (شریعت ،طریقت ،حقیقت) کو آپس میں ملحق کیا، انھوں نے ان شعبوں کو حکمت اور الٰہی الہام سے مالا مال کیا۔ اکیڈمی کے علاوہ، وہ اپنی سخاوت، غرباء کی مدد اور کھانا کھلانے کے لیے مشہور تھے۔ تقویٰ کے لیے ان کی شہرت شب کی نماز (تہجد) کے لیے ثابت قدمی اور محرم کے دوران امام حسین علیہ السلام کے لیے عزاداری سے نمایاں تھی۔ دروازہ نیشاپور کے قریب پینتالیس سال تک ایک ہی ستے گھر میں عاجزی کے ساتھ رہائش اختیار کرتے ہوئے انہوں نے سادگی اور عقیدت کو مجسم کیا۔ سبزواری محض ایک فلسفی ہی نہیں بلکہ ایک بزرگ بھی تھے، مشہور اسلامی فلسفیوں میں ایک نایاب مجموعہ۔ سادگی کی زندگی بسر کرتے ہوئے انھوں نے تمام پہلوؤں میں عمیق تقویٰ کا مظاہرہ کیا۔ ایک اہل سائر وسلوک کے طور پر پہچانے گئے، ایک روحانی مسافر، انھوں نے مادی املاک اور دنیاوی طاقت سے پرہیز کیا۔
ان کے خدمات: سبزواری نے عربی اور فارسی میں تقریباً چالیس کام لکھے۔ انہیں چار اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: 1۔ ملا صدرا کے کاموں پر حاشیہ 2۔ فلسفہ میں اصل کام، 3۔ دعاؤں اور فارسی ادب کی تفاسیر، 4۔ الٰہیات پر کام۔
انہوں نے اسرار کے نام سے نظم بھی لکھی۔ ان کی تفسیریں مدرسہ فصیحیہ میں ان کی تعلیم پر مبنی ہیں اور اس میں دیگر فلسفیانہ، مذہبی، گراماتی اور قانونی متون شامل ہیں جیسے:
اے۔ سہروردی (متوفی 1191) کی حکمت الاشراق (اشراقی فلسفہ) بی۔ لاہجی کی شوارق الالہام (متوفی 1661) ، سی۔ شیخ بہاء الدین عاملی (متوفی 1621ء) کی زبدۃ الاصول (فقہ کا خلاصہ) ڈی۔ شرح الفیات ابن مالک (ابن مالک کی ہزار آیات کی تفسیر) جلال الدین سیوطی (متوفی 1505)، ای۔ علامہ حلی (متوفی 1325) کی الابحاث المفیدہ (فائدہ مند مباحث)۔ ان میں سے کوئی بھی کام شائع نہیں ہوا ہے۔
شرح اسرار مثنوی: ان کے قابل ذکر کاموں میں شرح اسرار مثنوی (مسنوی پر" اسرار" کی تفسیر)۔ جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کی تقریباً ایک سو یا اس سے زیادہ "مشکل" آیات کی تفسیر ہے۔ (متوفی 1274) خراسان کے گورنر قاجار شہزادہ سلطان مراد مرزا حسم السلطنہ کے ذریعہ کمیشن کیا گیا اور آقا محمد باقر تہرانی کے ذریعہ 1285/1868 میں لتھوگراف کیا گیا۔ شاعری کے دوہے (ایک بیت شعر) کی اس آیت کی شکل کے نام سے منسوب، 'مثنوی معنوی' کو رومی کا عظیم نظم

سمجھا جاتا ہے ۔ اس کے بعد کے سالوں میں تحریر کردہ، اس میں صوفی کہانیاں، قرآنی آیات، حدیث، اور اخلاقی اور صوفیانہ تعلیمات شامل ہیں۔ چھ کتابوں میں منقسم 25,575 آیات پر مشتمل یہ کام رومی کے شاگرد حسام الدین چیلیبی کی درخواست پر لکھا گیا تھا۔ ملا ہادی سبزواری نے رومی کی مثنوی میں متضاد اقتباسات کی گرائمیکل وضاحت کی تصنیف کی ۔مزید برآں، انہوں نے قرآن کی فلسفیانہ تفسیر پر بھی توجہ دی۔ سبزواری کی تفسیر الیومینیشنسٹ (اشراقی) اور پیریپیٹیٹک فلسفیوں جیسے افلاطون، ارسطو، ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور ملاسدرا کی شرح اصول کافی جیسے کے متواتر حوالوں سے بھرپور ہے۔ یہ حوالہ جات ان کی پوری تفسیر میں یا فوٹ نوٹ کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں، جو ان کے دلائل اور وضاحتوں کو تقویت دینے کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ ایک زبردست مثنوی مبصر کی حیثیت سے ان کی مہارت اور قابلیت کی تصدیق کرتا ہے۔ قابل ذکر ہے، سبزواری کا شرح اسرار مثنوی رومی کی مثنوی کی واحد فلسفیانہ تفسیر کے طور پر کھڑا ہے، جو عقلی اور مابعد الطبیعاتی مباحث پر مبنی تشریحات پیش کرتا ہے، جو خود کو ادبی یا صوفی نقطہ نظر کو اپنانے والے دوسرے مفسرین سے ممتاز کرتا ہے۔

مثنوی کے بارے میں سبزواری کا تجزیہ حکمت روایت کے مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر سے جڑا ہوا ہے ،جس میں حکمت اور فلسفیانہ تصوف شامل ہے۔ اس تفسیر میں، وہ ایران میں قاجار سے پہلے کی نظریاتی فکری تحریک کی ایک جامع تحقیق فراہم کرتے ہیں، جس میں ملا صدرا کی تعلیمات اور سدریان مکتب پر ابن عربی کے گہرے اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ اثر قاجار دور (1925–1781) کے دوران بعد کے دانشوروں اور مکاتب فکر کے ذریعے دوبارہ بحال ہوا۔ سبزواری کی مثنوی کی تشریح زیادہ فلسفیانہ تصوف کی عکاسی کرتی ہے، جسے عرفان کے نام سے جانا جاتا ہے، جو صفوی دور میں رائج تھی۔ یہ ایرانی تصوف کے وسیع تر تاریخی اور فکری تناظر میں رومی کے کام کے ساتھ سبزواری کی مصروفیت کی گہرائی اور بھرپوریت کو واضح کرتی ہے۔ مثنوی کو بیان کرنے کے لیے ان کی لگن اور نظم پر ایک جامع تفسیر تخلیق کرنے کے لیے ان کے عزم کو اسلامی صوفیانہ مفکرین اور صوفی تھیوسفروں پر رومی کے شاندار کام کے لازوال اثر ورسوخ کو تلاش کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ فارسی بولنے والے علمی حلقوں میں مثنوی کی اہمیت، مختلف اسلامی مضامین جیسے کہ الہیات اور فلسفہ پر مشتمل ہے، پوری تاریخ میں برقرار ہے۔ اسکالرز اکثر اپنی تھیوسوفیکل اور مابعد الطبیعاتی روایات کے عینک سے نظم کی تشریح کرتے ہیں، ابن عربی (متوفی 1240) جیسی بااثر شخصیات کی اصطلاحات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کچھ اسکالرز نے مثنوی کے گرائمیکل اور ادبی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی ہے، جب کہ کچھ نے اپنی توجہ سبزواری کی شرح

اسرار پر مرکوز کی ہے،صوفی تعلیمات کے اپنے بنیادی موضوع پر زور دیتے ہیں۔رومی کے دور سے لے کر اب تک مثنوی کی متعدد تفسیریں سامنے آئی ہیں،جن میں قرآنی آیات، احادیث، خالق اور تخلیق سے متعلق الہیاتی اور مابعدالطبیعیاتی تصورات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سبزواری کی تفسیر اپنے مخصوص فلسفیانہ اسلوب اور انفرادی آیات کو واضح کرنے، مشکل اصطلاحات کی وضاحت کرنے اور تاثرات کو واضح کرنے پر باریک بینی سے توجہ دینے کی وجہ سے مثنوی تفسیروں میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔سبزواری نے ناصر الدین شاہ کے دور حکومت (1848-1896) کے دوران خراسان کے گورنر قاجار شہزادہ سلطان مراد مرزا حسم السلطانیہ کی درخواست پر اپنی تفسیر لکھی۔ابتدائی طور پر 1275/1896 میں تہران میں کتاب خانہ صنعائی کے ذریعہ شائع ہوا۔اس کام کو بعد میں آقا محمد باقر تہرانی نے 1285/1906 میں لیتھوگراف کیا اور بعد میں 1995 میں مصطفی بروجردی کے نظرثانی شدہ ایڈیشن میں چھاپا، جو تین جلدوں پر محیط تھی۔

بروجردی کے ایڈیشن میں، اضافی بصیرت اور وضاحتیں ان کے فوٹ نوٹ کے ذریعے فراہم کی گئی ہیں۔ بروجردی کے مطابق ،مثنوی پر سبزواری کی تفسیر انتخابی ہے، خاص طور پر پیچیدہ اور باطنی آیات پر توجہ مرکوز کرتی ہے جو مزید وضاحت کا مطالبہ کرتی ہیں۔سبزواری کی تفسیر چیلنج کرنے والی صوفیانہ اصطلاحات کو واضح کرنے، ادبی اور گراماتی باریکیوں کو حل کرنے، آیات کے مخصوص حصوں کی تشریح، حوالہ شدہ احادیث اور قرآنی آیات پر تبصرہ کرنے، باریک صوفیانہ تصورات کو کھولنے، غیر معروف الہیاتی، مابعدالطبیعاتی، اور پی ایچ ڈی کی پیشکشوں تک پھیلی ہوئی ہے۔پیچیدہ آیات کا، اور متنوع مخطوطات کو تسلیم کرنا جنھوں نے ان کے کام کو متاثر کیا۔

رومی کی مثنوی سے سبزواری کا دیباچہ: سبزواری کا دیباچہ مثنوی کے بارے میں ان کے نقطہ نظر اور فہم کی ایک قابل قدر مثال کے طور پر کام کرتا ہے۔ان کے اپنے الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے، یہ دیباچہ ان کی تفسیر کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ سبزواری کی تفسیر خود ایک عمیق فلسفیانہ کام ہے۔ بدقسمتی سے، اسے فارسی یا یورپی طلباء اور رومی کے اسکالرز کی طرف سے وہ توجہ نہیں ملی جس کے یہ مستحق ہیں۔جیسا کہ ہم تکنیکی اور انتہائی جامع دیباچہ کا مطالعہ کرتے ہیں، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف کو اسلامی الہیات اور صوفیانہ فلسفہ کا گہرا علم ہے۔مثنوی کی مندرجہ ذیل تفصیل پیش کرتا ہے:

یہ تفسیر ایک وسیع وسعت کے طور پر کام کرتی ہے، ایک بے پناہ گھاس کے میدان کے مترادف، اور روحانی شاعری کے جوڑوں کے وسیع ادب اور فکری تعلیمات کے اندر فکری پیاس بجھانے والی بہار

کی طرح پرورش کا ذریعہ ہے۔مسنوی المعنوی قرآن کی تصدیق شدہ تفسیر پر صرف ایک تفسیر ہونے کے بجائے، یہ اس کے باطنی اسرار کو تلاش کرتی ہے۔ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مثنوی قرآن کی واضح آیات کی وضاحت، پیشین گوئی کے کلمات کی وضاحت، اور نورانی قرآن کے مظہر کے طور پر کام کرتی ہے۔اس سے جلتے ہوئے انگارے نکلتے ہیں، اس کے چمکتے ہوئے چراغ سے شعاعیں نکلتی ہیں۔

قرآن میں پوشیدہ خزانوں کو کھولنے کی جستجو میں، مثنوی اپنی آیات میں سرایت شدہ قدیم فلسفیانہ حکمت سے پردہ اٹھاتا ہے، جس میں ایک جامع فصیح فلسفے کو مجسم کیا گیا ہے۔ درحقیقت، شاعرانہ آیات بغیر کسی رکاوٹ کے اسلام کے کینن قانون (شریعت) کو صوفی راستہ (طریقہ) اور الٰہی حقیقت (حقیقۃ) کے ساتھ مربوط کرتی ہیں۔رومی، مصنف، قانون، راستہ اور سچائی کی ایک ہم آہنگ ترکیب حاصل کرتا ہے، غیر معمولی فکری ذہانت، عمیق غور وفکر، ایک شاندار فطری مزاج، اور طاقت، بصیرت، الہام اور روشنی سے مالا مال کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔فضیلت اور کمال کی بحث میں وہ ممتاز بن کر ابھرتا ہے اور صوفیانہ کیفیات اور روحانیت کے لحاظ سے وہ ایک ماسٹر کے طور پر کھڑا ہوتا ہے۔شرح مثنوی کے دیباچے میں، سبزواری نے اپنی تفسیر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مسنوی کی وضاحت کرنے کی کوشش میں اپنے مقاصد کو واضح کیا ہے:

بلاشبہ، بہت سے لوگ مثنوی کے اندر بعض نکات اور حصوں کو قصہ پارینہ اور کہانیوں سے بھرپور سمجھتے ہیں۔اگرچہ ہر صفحے پر مواد کی تفہیم چیلنجوں اور پیچیدگیوں کا باعث بنتی ہے، لیکن صفحات کو اتفاق سے پلٹنے کا عمل آسان رہتا ہے۔سچائی کے متلاشی افراد کی مسلسل التجا نے مجھے اپنی پچھلی تحریروں کو ختم کرنے اور حتمی شکل دینے کی تلقین کی ہے۔نتیجتاً، میں نے ایک بار پھر مثنوی کی تفسیر اور وضاحت فراہم کرنے کے پر جوش کام میں خود کو غرق کر دیا ہے۔مقصد یہ ہے کہ وضاحت پیش کی جائے تاکہ آسانی سے لوگوں کو سچائی میں سکون ملے، اور جو لوگ تلاش کی طرف مائل ہیں وہ اس سے انتہائی خوشی حاصل کر سکیں۔مثنوی کے اندر موجود عمیق دانائی اور پوشیدہ بصیرت پر روشنی ڈالی، انہیں اس انداز میں پہنچانے کی کوشش کی جو قارئین کے فہم کے مطابق ہو۔ میں نے عربی اور فارسی اصطلاحات کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ قابل ذکر ادبی زیورات کی وضاحت کرنے کا بھی خیال رکھا۔اللہ تعالیٰ کی رحمتوں، نصرتوں، رہنمائی اور ہدایت سے شروع کی گئی یہ کوشش اس کی مدد سے ممکن ہوئی ہے۔درحقیقت، وہ حتمی وکیل اور برقرار رکھنے والا ہے۔

مثنوی کے اندر حکمت اور راز کی نوعیت کی وضاحت نہیں کی ہے، لیکن میری تفسیر سے یہ

بات واضح ہو جاتی ہے کہ میں رومی کی طرف سے اکثر استعمال ہونے والے استعاروں اور علامتوں کو گرامر کی وضاحت، لسانی وسعت، اور وضاحت فراہم کرتا ہوں۔ اپنی تفسیر کی جانچ پڑتال سے، جس میں میں رومی کو 'عظیم فضائل کا مظہر' اور 'عظیم صوفی' ہونے جیسی صفات بیان کرتا ہوں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں مثنوی کے تئیں احترام کا رویہ رکھتا ہوں۔ میرے نقطہ نظر میں، رومی کا کام علم کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے، جس میں متنوع اسلامی اور فکری علوم شامل ہیں جو شاعری اور کہانیوں سے مربوط ہیں۔ اس امتزاج کا مقصد قارئین کو حکمت کے پیچیدہ معاملات کو آسانی سے سمجھنے میں سہولت فراہم کرنا ہے۔

میرے مشاہدات علت، علم اور عقل پر واضح زور دیتے ہیں۔ میری گفتگو کا محور ان عناصر سے پیدا ہونے والے موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔ میں مثنوی کو ایک مضبوط طریقہ کار اور درست بیانیہ کے ساتھ ایک یادگار کام کے طور پر سمجھتا ہوں، ان کا پیغام الٰہی حکمت اور خدا کے کلام کے اہم پہلوؤں کی طرف ہے۔ نتیجتاً، میں زور دے کر کہتا ہوں کہ علم و دانش کے بلند درجے کے ساتھ صرف ایک قابل قدر نقطہ نظر ہی اس کے قارئین کی فکری پیاس کو بجھا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں فلسفیانہ اور فکری علوم کے ساتھ مثنوی کی تشریح کی وکالت کرتا ہوں۔ مثنوی مختلف خصوصیات پر محیط ہے، جس کا ایک اہم پہلو سبزواری کی نظر میں قدیم فلسفیانہ حکمت (الحکمت العتیقہ) سے منسوب ہے۔ یہ سبزواری کے تشریحی انداز کو سمجھنے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی تفسیر اسلامی قانونیت اور روحانیت کی ترکیب کے طور پر مسنوی کے کردار کو واضح کرتی ہے، شریعت، طریقہ، اور حقیقہ کو ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس حوالے سے سبزواری کی مثنوی اور سائنس تصوف کے لیے گہری عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ نہ صرف رومی کی تعریف کرتا ہے بلکہ اسے ایک کامل ولی اور غیر معمولی انسانی خصوصیات سے مالا مال صوفی کے طور پر بھی تعظیم کرتا ہے۔ سبزواری اپنی تفسیر کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ان محرکات کو واضح کرتے ہیں جنھوں نے ان کے کام کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی تشریح کے حالات اور فوائد مفصل ہیں، جو رومی کے شاہکار کے لیے وہ عمیق احترام اور تعریف پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اپنی تفسیر کے دیباچے کو جاری رکھتے ہوئے، سبزواری نے مثنوی کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان مقاصد کی وضاحت کی۔ یقینی طور پر، کچھ افراد اپنے آپ کو متن میں موجود حکایات اور حکایات سے اخذ کردہ ایک خاص حد تک فہم کے حامل پاتے ہیں۔ اگرچہ صفحات پر موجود مواد کو سمجھنا پیچیدہ اور چیلنجنگ ثابت ہوتا ہے، لیکن اتفاق سے مواد کو براؤز کرنا آسانی سے قابل انتظام رہتا ہے۔ روحانی حقیقت کے بارے میں اچھی طرح سے جاننے والوں نے مجھے اپنے پہلے کام کو ایک نتیجہ تک پہنچانے کے لئے

مستقل طور پر زور دیا ہے۔ نتیجتاً، میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو مثنوی پر اپنی تفسیر کی تشریح اور وضاحت کرنے میں غرق کر دیا ہے۔اس کوشش کا مقصد ان لوگوں کو سکون فراہم کرنا ہے جو اس وقت خود کو سمجھنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں، انہیں سچائی کی یقین دہانی میں آرام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ، یہ ان لوگوں کے لیے قیمتی بصیرت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو جوش و خروش اور خوشی کے ساتھ مواد کو تلاش کرنے کی طرف مائل ہیں۔مصنف کا نقطہ نظر مثنوی کو ایک پیچیدہ تصنیف کے طور پر غور کرنے میں واضح ہے، جس میں پیچیدہ اقتباسات اور اصطلاحات ہیں جن کی مکمل وضاحت کی ضرورت ہے۔آخر میں، سبزواری نے ایک مخصوص فکری فریم ورک یعنی حکمت (فلسفہ) کے ذریعے مثنوی کی تشریح میں ایک منفرد طریقہ اختیار کیا ہے۔سبزواری کی بنیادی توجہ اپنی تفسیر میں نفس الناطقہ (عقلی روح) کی تشبیہاتی باریکیوں کی نقاب کشائی پر ہے۔سبزواری نے مثنوی کی ہر آیت کی تفسیر نہیں کی۔اس کے بجائے، وہ اپنی توجہ منتخب، زیادہ پیچیدہ آیات پر مرکوز کرتے ہیں جو وضاحت کا مطالبہ کرتی ہیں۔سبزواری کی تفسیر میں مشکل الفاظ اور آیات کے مخصوص حصوں کی وضاحت شامل ہے۔مزید برآں، وہ مثنوی میں مذکور احادیث اور قرآنی آیات پر بحث کرتے ہیں، صوفیانہ پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں، الہیاتی، مابعدالطبیعاتی اور فلسفیانہ مضامین کو واضح کرتے ہیں، ادبی اور گراماتی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالتے ہیں، اور بعض آیات کے تنقیدی تجزیے پیش کرتے ہیں جس نے ان کے اسکرپٹ کو متاثر کیا ہے۔

کتابیات:۔اسرارِ سبزواری، ولی اللہ شرح زندگانی حاج ملاہادی سبزواری۔(سبزواری کی سوانح عمری) سبزوار: بیہق 1953۔2۔چٹک، ولیم سی۔دی سیلف ڈسکلوزر آف گاڈ: ابن عربی کا سمولوجی کے اصول۔3۔ابن عربی محی الدین۔فصوص الحکمۃ (دی رنگ ٹونس آف وسڈم) 4۔مسلم فلسفہ کی تاریخ، جلد۔1، ایڈ۔ایم ایم شریف 5۔نکلسن، رینالڈاے رومی: شاعر اور صوفی۔6۔رومی جلال الدین۔جلال الدین رومی کی مسنوی، ایڈیشن۔اور ٹرانس۔رینالڈاے۔نکلسن۔8 جلدیں لندن۔7۔شرح مثنوی، مطبوعہ مصطفیٰ بروجردی 3 جلد تہران۔8۔ایڈورڈ گرانویل براؤن، فارس کی ادبی تاریخ، 4 جلد، لندن، 30-1929، چہارم، صفحہ 37-436۔9۔مُحمد اقبال، فارس میں مابعدالطبیعیات کی ترقی (لاہور: بزمِ اقبال 1959)، صفحہ۔135۔10۔سید حسین نصر، "ایران میں نشاۃ ثانیہ" ایم ایم شریف میں، ایڈ، مسلم فلسفہ کی تاریخ، ویزبادن، 1966، صفحہ 55-1543۔11 منظومہ و شرحِ منظومہ۔☆☆☆